رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ جلد ۳۶ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

فہرست مضامین

رجب، شعبان، رمضان، شوال سنہ ۶۳ھ (جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر سنہ ۴۴ء) جلد ۲۵ عدد ۱، ۲، ۳، ۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چیمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر، دارالاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(از مسعود عالم ندوی)

یوں تو کاغذ کی کم یابی اور نئے قانون کی جکڑ بندیوں کے باعث رسالے کی اشاعت میں ابتری پیدا ہو گئی تھی، مگر زیر نظر اشاعت میں ایک دوسری وجہ سے بھی کافی تاخیر ہو گئی۔ مولانا مودودی دو ہفتوں سے علیل ہیں، نزلہ و زکام کا شدید حملہ ہے۔ ابھی ہفتہ عشرہ انھیں مکمل آرام کی ضرورت ہے، صرف اشارات کے انتظار میں پرچہ رکا ہوا تھا، مزید تاخیر نامناسب معلوم ہوئی، اس لیے اس ماہ "ترجمان" کی خدمت راقم الحروف کے سپرد کی گئی جو اپنی نااہلیت کے اعتراف کے باوجود اسے بادلِ ناخواستہ قبول کرنا پڑی۔ کوتاہیوں اور لغزشوں کے لیے ناظرین سے چشم پوشی کی درخواست ہے۔

کاغذ کے متعلق نئے قانون سے تمام رسالوں کی زندگی دوبھر ہو رہی ہے۔ ہماری راہ میں بھی اس وجہ سے بڑی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ کاغذ کی رسد کی حد درجہ کمی اور مضامین کی فراوانی کا اس کے سوا کوئی حل نظر نہیں آیا کہ رسالہ $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$ کی جگہ $\frac{۲۰\times۳۰}{۸}$ کی تقطیع پر شائع ہو۔ اور مسطر خفی سے خفی کر دیا جائے۔ اللہ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ اس طرح پر زیادہ سے زیادہ مضامین کی گنجائش نکل سکے گی۔ یہ ابتلا عالمگیر ہے، اور اس سے مفر کی کوئی راہ نہیں۔ جب تک شیاطین جن و انس کا برپا کیا ہوا یہ طوفان جاری ہے، صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ امید ہے کہ ہمارے ناظرین بھی اس ابتلائے عام میں ہماری دشواریوں کا احساس کرتے ہوئے صبر و ضبط سے کام لیں گے۔

کاغذ کی کم یابی، ہوش ربا گرانی اور چور بازار کی مصیبتوں سے نشر و اشاعت کا سارا نظام بھی درہم برہم ہو رہا تھا، ملک کے طول و عرض سے لٹریچر کے پورے سٹ کا مطالبہ ہوتا تھا، لیکن ہمارا مکتبہ اس کی تعمیل سے قاصر تھا۔ فرمائشوں کی عدم تعمیل کے باعث لٹریچر کے قدر دانوں میں مایوسی پیدا ہو چلی تھی۔ لیکن مکتبہ کے کارکن کوششوں سے غافل نہیں تھے، آخر توفیق الٰہی سے، جدید کنٹرول آرڈر کا نفاذ شروع ہونے سے پہلے ہی ہمارے پاس کاغذ کا معتد بہ ذخیرہ فراہم ہو گیا جس سے از سرِ نو لٹریچر کا پورا سٹ مکتبہ میں جمع ہو گیا ہے۔ ہماری دعوت کے پھیلنے میں لٹریچر کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اب کہ یہ رکاوٹ دور ہو گئی ہے، جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کا فرض ہے کہ اشاعت کے کام میں لگ جائیں، اور جو موقع مل رہا ہے، اسے غنیمت شمار کریں نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ پھر یہ آسانیاں حاصل ہو سکیں گی یا نہیں؟

ہم اقامت دین کا جو کام لے کر کھڑے ہوئے ہیں، اس کا دائرہ عمل کسی ایک ملک، قوم یا خطۂ ارض میں محدود نہیں۔ اس لیے

ابتدا ہی سے ہندوستان اور دنیا کی دوسری مشہور زبانوں میں لٹریچر کے ترجمے کا خیال پیش نظر رہا ہے۔ گو حالات کی ناساعدت کے باعث رفتار تیز نہیں ہو سکی ہے۔ انگریزی میں صرف چند رسالے منتقل ہوئے ہیں، ابھی بڑا کام باقی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بھی جابجا کام ہو رہا ہے۔ بنگال و آسام کا علاقہ، ہماری دعوت سے اب تک بالکل ناآشنا ہے۔ بنگلہ ترجمہ کا کام پٹنہ میں شروع ہو گیا ہے، مگر ابھی رفتار سست ہے۔ شانتی نکیتان میں بھی ایک صاحب علم نے تعاون کا وعدہ کیا ہے، اللہ کرے، یہ دعوت ان کے دل میں گھر کر جائے اور مشرقی ہندوستان کو اسلامی تحریک سے روشناس کرانے کا کام وہ اپنے ذمے لیں۔ اس سلسلہ میں بہار و بنگال کے ارکان جماعت کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں، ہم توقع کرتے ہیں کہ وہ کوتاہی سے کام نہیں لیں گے۔ ترکی ترجمہ خود دارالاسلام میں ایک ترکستانی ادیب کر رہے ہیں۔

مگر ان سب کے ساتھ جو حقیقت تلخ اور تکلیف دہ بھی وہ یہ کہ عربی زبان میں اب تک لٹریچر کے منتقل کرنے کا کوئی خاطر خواہ نظم نہیں ہو سکا ہے اور عربی کا کام دوسری زبانوں سے زیادہ دشوار اور اہم بھی ہے۔ عدن سے لے کر مغرب اقصیٰ تک عربی بولنے والی قوموں کی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ عربی بولنے والوں کی آبادی سات کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ مشرقی افریقہ کے بعض علاقوں اور جزیروں میں بھی عربی کا چلن مادری زبان کی طرح ہے۔ جنوبی امریکہ میں بھی عربوں کی بڑی نوآبادی ہے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان ہیں اور کچھ عیسائی اور دوسری قومیں۔ بعض علاقوں (جیسے لبنان) میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اس پوری آبادی کو عربی زبان ہی کے ذریعہ خطاب کیا جا سکتا ہے۔ ان میں جابجا ایسے طبقے بھی ہیں (جیسے مراکش، الجزائر، نجد، یمن) جو ابھی اسلام کی تعلیمات سے زیادہ دور نہیں ہوئے اور اگر انھیں صحیح طریقہ پر دعوت دی جائے، تو وہ آسانی سے اقامت دین کی دعوت پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان میں ایسے فرقے بھی ہیں (جیسے دروزی، یزیدی) جو ابتدائی صدیوں ہی میں اسلام کی تعلیم سے دور جا پڑے، اور آج تک وہ اپنے مخصوص عقیدوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں۔ فقہی مذاہب کے لحاظ سے بھی، عربی ملکوں میں چاروں اماموں (ائمہ اربعہ) کے متبعین پائے جاتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے بعض خطے (مصر، عراق، شام) عربی قومیت کے نشے میں سرشار ہیں ـــــ کہنا یہ ہے کہ عربی بولنے والی سات کروڑ آبادی ہندوستان کی طرح یکساں (Homogeneous) خیالات نہیں رکھتی۔ عربی بولنے والی قوموں کو دین کی دعوت دینے کے لیے بڑی تیاری اور دوربینی کی ضرورت ہے۔ اور نوع بنوع مریضوں کے لیے مختلف قسم کا تریاق بھی تیار کرنا پڑے گا۔

جماعت کے موجودہ لٹریچر کا صرف ترجمہ کر دینا عربی داں پبلک کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ لٹریچر کے ترجمے میں بھی عرب کے مخصوص حالات و افکار کے اعتبار سے جابجا ضمنی تبدیلیاں اور اضافے کرنا ہوں گے۔ نیز اچھا خاصہ صالح لٹریچر براہ راست عربی زبان میں تیار کرنا پڑے گا جو وقت کے چلنسار اور مقبول عام افکار کے مقابلے میں اسلامی فکر اور اسلامی تحریک کو صحیح اور سائنٹفک طریقے پر پیش کر سکے۔ یہ صالح لٹریچر اپنی زبان، طریقۂ نظر و فکر اور اسلوب بحث کے لحاظ سے اتنا ممتاز اور نمایاں ہو کہ دل اس کی طرف خود بخود کھنچ جائیں اور دماغ اس سے اثر پذیر ہو سکیں۔

یہ کام صرف صالح لٹریچر کی تیاری سے بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ہمیں ایک اعلیٰ درجہ کے ماہنامہ کی ضرورت ہوگی، جو ایک طرف تو اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے عربی کے مشہور رسالوں کے مقابلے پر آ سکے، دوسری طرف وقت کے تمام مسائل پر اسلامی نقطہ نظر سے بے لاگ تنقید کر سکتا ہو۔ بدنصیبی سے عربی دنیا کی ادبی قیادت مصر کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور مصری صحافت کا بڑا حصہ شامی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو اخبار اور رسالے مصریوں کی ادارت و انتظام میں نکلتے ہیں، وہ مصری قومیت اور فراعنہ پر فخر کرنا اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ مصری زندگی میں دین ایک پرائیوٹ چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ مصر کی سب سے بڑی قوم پرور اور سرفروش پارٹی حزب الوفد ہے، جس کی بنیاد سعد زغلول مرحوم (ف سنہ ۱۹۲۷ء) نے رکھی تھی۔ اس پارٹی کا شعار سعد زغلول کا مشہور فقرہ:-

الدينُ للهِ والوطنُ للجميع

ہے، جس سے زیادہ گمراہ کن سیاسی نعرہ شاید ہی اس دور میں بلند کیا گیا ہو۔ قبطیوں کے ملانے کے لیے، وفدیوں نے "دین" کو اللہ اور بندے کا ایک ذاتی معاملہ بنا کر رکھ دیا ——— یہ تو مصر کے صحافیوں اور سیاست کاروں کا عالم ہے، جو گذشتہ پچاس برسوں میں تمام عربی ملکوں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، اور آج بھی ان کا اثر کم نہیں ہوا بلکہ بڑھ ہی رہا ہے۔ علماء کا حال ان سے بھی بدتر ہو گیا تھا، اور افسوس کہ آج بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ ان کا حلقہ اثر و نفوذ مسجدوں اور خانقاہوں تک محدود ہے۔ سیاسی پلیٹ فارم اور ادبی سوسائٹیوں پر ان کا کوئی اثر نہیں۔ گو جامع ازہر نے اپنے تعلیمی منہاج کی ایک حد تک اصلاح کر لی ہے، مگر ازہریوں کا نصب العین بھی سرکاری ملازمتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ارباب دین کی بے توجہی کا یہ عالم ہوا کہ روزانہ صحافت تو دین سے بے پروا ہو ہی چکی تھی، ماہانہ رسالے بھی دین سے بے تعلقی کو اپنا شعار بنانے لگے۔ پچھلے بیس پچیس سالوں میں المنار اور الزہراء دو قابل ذکر مذہبی رسالے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ المنار علامہ سید رشید رضا مرحوم (ف سنہ ۱۳۵۳ھ) کا رسالہ تھا۔ اس کی اشاعت مصر سے زیادہ مصر کے باہر تھی۔ سید رشید مرحوم کی وفات کے ساتھ گویا وہ بھی دفن ہو گیا۔ الزہراء ایک علمی رسالہ تھا، جو مسلمانوں کے علوم و فنون پر تحقیقی مقالات شائع کرتا تھا، وہ بھی عرصہ ہوا ناقدری کے باعث چند سال زندہ رہ کر آپ اپنی موت مر گیا۔ اب مصری ماہانہ صحافت پر بھی ان لوگوں کا قبضہ ہے، جو دین سے بیگانہ اور یورپ سے مرعوب ہیں، اور ان کا مطمح نظر حصول نام و نمود کے سوا اور کچھ نہیں.........

یہ حالات ہیں، جن کے پیش نظر جماعت نے ایک بلند پایہ عربی ماہنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ابھی تو جنگ کی فتنہ سامانیوں کے باعث آغاز کار بہت مشکل ہے، لیکن یہ رائے طے پا چکی ہے کہ جنگ کے ختم ہوتے ہی عربی بولنے والی قوموں کو اسلامی دعوت اور اقامت دین کی تحریک سے روشناس کرانے کے لیے ایک رسالہ جاری کیا جائے۔ چونکہ کام اہم ہے اور اس کے لیے بڑی تیاریوں کی ضرورت ہے اس لیے راقم الحروف اپنا مستقر چھوڑ کر دارالاسلام آگیا ہے، تاکہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عربی زبان میں ترجمہ اور لٹریچر کی تیاری کا کام باضابطہ اور منظم طور پر شروع کر دیا جائے، اور اس دوران میں اتنا کام ہو جائے کہ جنگ کے بعد عربی زبان میں نشر و اشاعت کا کام بلا پس و پیش شروع کیا جا سکے۔

اس سلسلہ میں سردست حسب ذیل کام ہمارے پیش نظر ہیں:-

(۱) جماعتی لٹریچر میں سے چیدہ چیدہ رسالوں کا عربی میں ترجمہ۔ (۲) لٹریچر سے بعض کتابوں کا ترجمہ، ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ

(۳) عربی زبان میں مختلف موضوع پر مستقل رسالے اور کتابیں تیار کرنا جن میں عربی ممالک کے مخصوص مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے بحث کی جائے۔

(۴) جنگ کے بعد عربی ماہنامہ کی ادارت کے لیے اپنے کو تیار کرنا۔

ان میں سے آخرالذکر کام راقم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے، اور اللہ کا نام لے کر اس نے تیاری شروع کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں گزشتہ نصف صدی کی تمام اہم عربی مطبوعات مطلوب ہیں۔ پچھلی نصف صدی کے اندر عربی دنیا میں جتنی دینی، سیاسی اور اجتماعی تحریکیں رونما ہوئیں، ان سب کا گہرا مطالعہ کیے بغیر عربوں کی موجودہ نفسیات اور قومی مزاج اور فکری ماحول سے واقفیت ناممکن ہے اور اس واقفیت کے بغیر دعوت و تبلیغ کے فرض سے عہدہ برآ ہونا دشوار ہے۔ مذہبی، تاریخی، ادبی ہر قسم کے مطبوعات کی ضرورت ہے۔ نیز اہم عربی رسالوں اور ہفتہ وار ادبی منشورات کی جلدیں بھی مطلوب ہیں۔ خاص کر المقتبس، المقتطف، الہلال، المنار، الزہراء، السیاسۃ الاسبوعیۃ، مجلۃ المجمع العلمی العربی، الرسالۃ، الثقافۃ، المعرفۃ کی جلدوں کی سخت ضرورت ہے۔ جن ارکان اور ہمدردوں کے پاس ان مطبوعات کا ذخیرہ ہو، وہ ہدیۃً یا استعارۃً جماعت کی لائبریری کو عنایت فرمائیں۔ ان کے علاوہ جو حضرات اس قسم کے ذخیرے الگ کرنا چاہیں وہ براہ کرم اطلاع دے کر شکر گذار کریں۔ ہمارے کارکنوں اور ہمدردوں کو خاص طور پر اس طرف توجہ کرنا چاہیے کہ یہ ایک فرد واحد کا کام نہیں۔ اور موجودہ حالات میں بیرون ہند ضروری کتابوں کی خریداری بھی ناممکن ہے۔

جماعتی لٹریچر سے منتخب رسالوں کے ترجمے کا کام لکھنؤ اور دہلی میں بعض دوستوں نے شروع کر رکھا ہے۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں کام کی رفتار سے مطلع کریں اور اپنی ترجمہ شدہ تحریریں ہمارے پاس بھیجتے رہیں، تاکہ مشورہ و خط و کتابت سے ترجمہ کے لیے ایک مرتب خاکہ تیار کر لیا جائے اور اسی کے مطابق تمام رفقاء کام کریں۔ نیز اور جو اصحاب اس مہم میں ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیں، وہ بخوشی ہمیں اطلاع دیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہمیں ٹھیکہ اور معاوضے پر کام کرنے والے مترجم مطلوب نہیں ہیں ہمیں ایسے رفیقوں کی ضرورت ہے، جو اسلامی تحریک کے نصب العین اور طریق کار سے حرف بحرف متفق ہوں، اور جذبۂ تبلیغ و عمل ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہو۔ وہ اس کام کو ایک دینی خدمت سمجھ کر انجام دیں۔

مذکورہ بالا میں جن ضرورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے لیے پختہ کار اہل قلم مطلوب ہیں۔ ہمارے علم میں ارکان جماعت کے اندر ایسے افراد موجود ہیں، جو اس فرض کو کماحقہٗ انجام دے سکتے ہیں، ضرورت صرف توجہ اور مستعدی کی ہے۔ راقم الحروف بھی مستقل لٹریچر کے تیار کرنے میں اپنی سعی و کوشش سے دریغ نہ کرے گا۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی یہ تحریک جس باغیانہ ماحول اور ناسازگار حالات میں کھڑی ہوئی ہے، ان سے یہ توقع رکھنا بے سود ہوگا کہ ہمیں بنے بنائے کارکن مل سکیں گے۔ دو تین سال کے تجربے سے یہ حقیقت آئینہ ہو گئی ہے کہ جو ارباب دانش کسی جماعت سے وابستہ ہو چکے ہیں وہ آسانی کے ساتھ ہماری دعوت پر لبیک نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے اگر اسلامی تحریک کو آگے بڑھانا ہے تو اس کے لیے ہمیں خاص طور پر کارکن تیار کرنا ہوں گے۔ اور یہ کام نظام تعلیم کی تبدیلی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ بدقسمتی سے اس وقت ملک میں تعلیم کے جتنے نظام رائج ہیں ان میں سے کوئی ہماری ضرورتوں کے لیے کفایت نہیں کرتا۔ سرکاری نظام تعلیم تو یکسر لادینی (Secu.lar) ہے۔ ان "قتل گاہوں" میں، جو ملک کے

طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں، نوجوانوں کو ان کے قومی و ملی تشخصات سے الگ کر کے زمانہ کی طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس نظام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ انتہائی بے مقصد ہے اور طالبعلموں میں کوئی ایجابی (Positive) کردار نہیں پیدا کرتا۔ قدامت سے سر پر تو یہ بڑی جوش و خروش کے ساتھ تیشہ زنی کرتا ہے۔ لیکن "تجدد" کے وہ اوصاف اور کردار بھی نہیں پیدا کرتا، جو یورپی طریقہ تعلیم کی خصوصیات میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف ہمارے عربی مدارس کا قدیم نظام تعلیم ہے۔ ان کے چلانے والے نئے حالات و مقتضیات سے بالکل بے خبر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ "دین" کا صحیح تصور اب تک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ان کے روشن خیالوں کا یہ عالم ہے کہ "دینی" تعلیم (یعنی قدیم درس نظامی) میں جدید علوم و فنون اور انگریزی زبان کی آمیزش کو "طریقہ سلف" کے خلاف شمار کرتے ہیں۔ "دین" کا یہ محدود تصور جو فرائض خمسہ کی ادائی تک محدود ہے دنیا کے نئے افکار و حالات سے بے خبری کو مبارک اور مستحسن سمجھتا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آج دنیا بدل چکی ہے۔ یورپ کی مادی تحریکیں نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو کر قلب اسلام پر حملہ آور ہیں۔ سیاسیات اور معاشیات کی راہ سے آئے دن نت نئے نظریے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں سے جب کوئی یک بیک ان نظریوں سے دوچار ہوا تب، اس کی آنکھیں خیرہ اور افکار مسموم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسی طرح جب اس فرسودہ نظام تعلیم کے چلانے والے سیاسیات میں آئے ہیں، تو جدید شیطانی سیاست کے شاطروں کے ہاتھوں انھیں بری طرح زک ہوئی ہے۔ حقیقت میں یہ قصور مخصوص افراد کا نہیں، یہ اس ادھوری مذہبی تعلیم کا قصور ہے جو "دین" کو فقہی مذاہب اور قرآن و حدیث کی رسمی تعلیم میں منحصر سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے روشن خیال علماء ہندوستان کی مسلم درسگاہوں کی تقسیم چار شعبوں (مذہبی، مذہبی دنیا آمیز، دنیوی، دنیوی دین آمیز) میں کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی کامل "دینی" درسگاہ کہلانے کی مستحق نہیں۔ دین انسانی زندگی کے مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے، حیات انسانی کا کوئی شعبہ اس کے دائرہ عمل سے باہر نہیں۔ جو نظام تعلیم ایک مسلمان کو "دین کامل" کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تیار نہیں کرتا وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت تو واضح ہو گئی کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم خواہ جدید ہو یا قدیم، اسلامی تحریک کی مقتضیات کو پورا کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ اسلامی تحریک کو جس قسم کے نظام تعلیم کی ضرورت ہے، اس کی نشان دہی مولانا مودودی نے اپنے خطبہ "نیا نظام تعلیم" میں کر دی ہے۔ مختصر طور پر بیان اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ نئے نظام تعلیم میں جدید و قدیم یا دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہو گی، ہم نوجوانوں میں وہ تمام اچھے اور بلند اوصاف پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت قدیم و جدید مدارس کی خصوصیات شمار کی جاتی ہیں۔ ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ ایک طرف ہمارے طلبہ ان تمام علمی و اخلاقی صفات سے آراستہ ہوں جن پر ہمارے پرانے مدرسوں اور نئی یونیورسٹیوں کو فخر ہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ ان صفات سے آراستہ ہوں، بلکہ ان اوصاف میں بھی موجودہ درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلبہ سے بڑھ چڑھ کر ہوں۔ ان کے علاوہ ہم نوجوانوں میں کچھ ایسے علمی و اخلاقی صفات پیدا کرنا چاہتے ہیں جن سے مسلح ہو کر وہ باطل کے مقابلے پر آ سکیں۔ ان کی علمی صلاحیت اتنی بلند ہو کہ وہ نظام باطل کے علمی اور تحقیقی قلعوں کو اپنی تنقید کی ضرب سے پاش پاش کر دیں، دوسری طرف ان کا اخلاقی کردار اتنا ممتاز ہو کہ وہ بے خوف و خطر سیاست و عمل کے میدان میں اسلامی اخلاق کی عظمت کا سکہ بٹھا سکیں۔

امیر جماعت نے نئے نظام تعلیم کا خاکہ تو ۱۹۴۰ء ہی میں مرتب کر لیا تھا، لیکن جنگ کی تباہ کاریوں کے باعث اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔ مگر انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ رفقاء اور ہمدردوں کی طرف سے تقاضے ہونے لگے، اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ موجودہ حالات ہی میں جیسا کچھ بن پڑے مجوزہ تعلیم گاہ کی داغ بیل ڈال دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلے قیم جماعت کی طرف سے ایک مبسوط سوال نامہ شائع کیا گیا، پھر ایک تعلیمی مجلس منعقد کی گئی۔

جس کی مفصل کارروائی زیرِ نظر اشاعت میں آگئی ہے۔ اس سے ہمارے ارکان اور ہمدردوں کو تعلیمی پروگرام کی پوری واقفیت ہو جائے گی۔

سردست اندازہ یہ ہے کہ ۱۰۰ طلبہ سے ابتدائی اور ۶۰ طلبہ سے ثانوی درسگاہ کا آغاز کیا جا سکے گا۔ کام بڑا ہے اور اس کے لیے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ایک دار الاقامہ کی تعمیر ناگزیر ہے۔ دو عمارتیں ابتدائی اور ثانوی درسگاہوں کے لیے ہوں گی۔ کم سے کم بیس پچیس اساتذہ کے لیے کوارٹر بنانا ہوں گے۔ موجودہ مسجد بہت چھوٹی ہے، ایک وسیع مسجد بھی تعمیر کرنا ہوگی جس میں پانچ چھ سو نمازیوں کی گنجائش ہو سکے۔ ان کے علاوہ لائبریری کے لیے بھی ایک خاص عمارت کی ضرورت ہوگی ــــــ گو موجودہ حالات میں عالیشان عمارتوں کی تعمیر ناممکن ہے، عمارتیں بالکل سادہ اور خام ہوں گی پھر بھی موجودہ ہوشربا گرانی کے باعث کافی زیرباری ہوگی۔

درسگاہ کی تشکیل کے ساتھ ساتھ مرکز کا مسئلہ بھی طے پا گیا ہے۔ اور اب دار الاسلام ہی کی نوآبادی جماعت کا مستقل مرکز قرار پا گئی۔ اس لیے کارکنوں کی تربیت کا مسئلہ بھی زیرِ غور ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ لٹریچر سے متاثر ہو کر پرجوش نوجوان جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، مگر تربیت کی کمی کے باعث اسلامی تحریک کی روح کو وہ جذب نہیں کر پاتے۔ اس لیے آغاز ہی سے تربیت گاہ کا قیام بھی امیر جماعت کے پیشِ نظر تھا۔ اور اب اس باب میں بھی فوری اقدام کی ضرورت ہے۔ لیکن تربیت گاہ کے لیے بھی عمارت کی ضرورت ہوگی۔ مزید تعمیر کے بغیر اس کا افتتاح بھی مشکل ہے۔

خلاصہ یہ کہ درسگاہ اور تربیت گاہ کے سلسلے میں ہماری ضرورتیں بہت ہیں۔ اور اللہ پر توکل کے سوا ہمارے پاس کوئی ظاہری سرمایہ بھی نہیں ہے۔ ہم اپنے اصول کے مطابق اصحابِ جاہ و ثروت کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ جن اصحاب کو ہمارا کام اپیل کرے، اور انھیں ہماری دیانت اور کارکردگی پر اعتماد ہو، وہ خود اپنا حصہ پیش کریں۔ اس میں وہی اصحاب خیر پیش قدمی کریں جو خالصۃً لوجہ اللہ جماعت کی امداد کرنا چاہیں اور انھیں کسی طرح کا نام و نمود مطلوب نہ ہو۔ عطایا کتنے ہی بیش قرار ہوں، ہماری پالیسی پر نظر انداز نہیں ہو سکیں گے اور نہ اخباروں اور رسالوں میں ان کا شکریہ ادا کیا جائے گا ــــــ اب ہمارے رفقا اور ہمدردوں کا فرض ہے کہ وہ ہمت سے کام لے کر آگے بڑھیں، تاکہ تعمیر کا کام پروگرام کے مطابق جلد از جلد تکمیل کو پہنچ جائے۔ اور درسگاہ کے افتتاح میں تعویق یا التوا نہ ہو ــــــ ورنہ ہم اپنی بساط بھر جو کچھ بن پڑے گا، کرتے رہیں گے، خواہ مجوزہ پروگرام کی تکمیل میں کتنی ہی دیر لگے۔ تاخیر گوارا ہے، مگر اصول سے ہٹنا منظور نہیں۔

جماعت کے سامنے جو اہم علمی اور تحقیقی کام درپیش ہیں، ان کے لیے ایک اچھی لائبریری کا قیام بھی ناگزیر ہے۔ مختلف شعبوں کی مختلف ضرورتیں ہیں، درسگاہ کے لیے درسی کتابیں مطلوب ہیں۔ نصابِ تعلیم کی ترتیب کے لیے وہ تمام نئی اور پرانی کتابیں چاہئیں، جو مدرسوں اور کالجوں میں داخلِ درس تھیں یا ہیں۔ جن اصحاب کو نئی یا پرانی درسی کتابوں کا علم ہو، وہ ہماری امداد کریں، یا ان کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ نیز فنِ تعلیم اور معلوماتِ عامہ کے متعلق ہر قسم کی کتابیں، اور ہر زبان میں مطلوب ہیں۔

درسگاہ کی تشکیل اور تعلیمی پروگرام کے نفاذ کے بعد جماعت کے پیشِ نظر شعبۂ تحقیق و تالیف (Academy) کی تاسیس ہے۔ اس کے لیے بھی عنقریب ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی جائے گی۔ اس کے لیے ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت ہوگی۔ اور ہمیں ابھی سے کتابوں کی فراہمی کی کوشش شروع کر دینا چاہیے۔ ہمارے ہمدردوں میں سے جو اصحاب علمی کتابیں (خواہ کسی زبان میں ہوں) مجوزہ لائبریری کو ہدیہ کر سکیں یا مستعار دے سکیں، وہ ہمیں اپنی کتابوں کی فہرست سے مطلع کریں، اور جو اصحاب نظر فراہمی کتب کے سلسلے میں کوئی مناسب مشورہ دے سکیں، وہ بھی بخل سے کام نہ لیں۔

تفہیم القرآن

(۱۷)

الاعراف

(از رکوع ۱۰ تا رکوع ۲۳)

اور ثمود[1] کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے[2]، لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے، اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب

---

[1] یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے اس کے قصے اہلِ عرب میں زبان زدِ عام تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان، اسکندریہ اور روم کے مورخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے، چنانچہ رومی مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے جن سے ان کی دشمنی تھی۔

اس قوم کا مسکن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الحِجر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں، یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حِجر کہلاتا تھا۔ اب تک اس علاقہ میں ثمودی آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ مگر نزولِ قرآن کے زمانہ میں تو جگہ جگہ ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر رہتے تھے اور حجاز کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے ان کھنڈروں کے درمیان سے گذرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گذرے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثار قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشان دہی کرکے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے کھنڈروں میں جو مسلمان سیر کرتے پھر رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں ... کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اُس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا، لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ، یہ سیر گاہ نہیں ہے بلکہ رونے کا مقام ہے۔

[2] ظاہر عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہی اونٹنی ہے جسے اس دوسرے

تمھیں آئے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اُس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو[۱]۔ پس اللہ کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو[۲]"۔

اُس کی قوم کے سرداروں نے، جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقہ کے اُن لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انھوں نے جواب دیا "بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اُسے ہم مانتے ہیں"۔ اُن بڑائی کے مدعیوں نے کہا "جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں"۔

پھر انھوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا[۳] اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گذرے، اور صالح سے

(بقیہ) فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالح سے مطالبہ کیا تھا جو ان کے ماموریت من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالح نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمھاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمھاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پییں گے۔ اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزادانہ چرنے پھرنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پییں، بادل ناخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انھوں نے اسے قتل کیا، درآں حالے کہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انھیں کوئی خوف ہوتا، اس حقیقت پر مزید دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اونٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور (Sanction) ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔ قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اونٹنی کیسی تھی اور کس طرح وجود میں آئی۔ کسی حدیث صحیح میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیت پیدائش کے متعلق نقل کی ہیں، لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ ثمود کی یہ صنعت ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلورا، اجنٹہ اور بعض دوسرے مقامات پر پائی جاتی ہے، یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے۔ حجر کے علاقے میں ابھی تک ان کے تراشے ہوئے بعض غار موجود ہیں جنھیں سیاحوں نے دیکھا ہے۔

۲؎ یعنی عاد کے انجام سے سبق لو۔ جس خدا کی قدرت نے اس مفسد قوم کو برباد کر کے تمھیں اس کی جگہ سربلند کیا، وہی خدا تمھیں برباد کر کے دوسروں کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے اگر تم بھی عاد کی طرح مفسد بن جاؤ۔

۳؎ اگرچہ مارا ایک ہی شخص نے تھا، جیسا کہ سورۂ قمر اور سورۂ شمس میں ارشاد ہوا ہے، لیکن چونکہ پوری قوم اُس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں قوم کی مرضی کا آلۂ کار تھا اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔

کہہ دیا کہ "لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے۔" آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت ۶۱ نے انہیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادران قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تم کو پہنچا دیا، اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔"

اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا، پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے ۶۲ کہا "کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو! حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔" ۶۳ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ "نکالو ان لوگوں کو اپنی بستیوں سے، بڑے پاکباز

---

۶۱ اس آفت کو یہاں "رجفہ" (اضطراب انگیز، ہلا مارنے والی) کہا گیا ہے، اور دوسرے مقامات پر اسی کے لیے "صَیْحَہ" (چیخ)، "صاعقہ" (کڑکا) اور "طاغیہ" (سخت زور کی آواز) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۶۲ یہ قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرق اردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور یہ عراق اور فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس قوم کے صدر مقام کا نام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرۂ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے ناپید ہے اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرۂ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ سرزمین عراق سے ہجرت کرنے کے بعد کچھ مدت تک اپنے چچا کے ساتھ شام، فلسطین و مصر میں گشت لگا کر دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم شاید اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ ان کا رشتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہوگا۔

یہودیوں کی تحریف کردہ بائیبل میں حضرت لوط کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ دھبے لگائے گئے ہیں وہاں ایک دھبہ یہ بھی ہے کہ آں جناب حضرت ابراہیم سے لڑ کر سدوم کے علاقے میں چلے گئے تھے۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر اس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

۶۳ دوسرے مقامات پر اس قوم کے بعض اور اخلاقی جرائم کا بھی ذکر آیا ہے، مگر یہاں ان کے سب سے بڑے جرم کے بیان پر اکتفا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا۔

یہ قابل نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرت دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آئے، لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی اُسے موجودہ یورپ نے پورا کیا کہ علانیہ اس فعل کو قانوناً جائز ٹھیرانے کے لیے زبردست پروپیگنڈا کیا گیا یہاں تک کہ ایک ملک کی مجلس قانون ساز نے اسے جائز ٹھیرا بھی دیا۔ حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرت ہمجنس قطعی طور پر وضع فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع میں نر و مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے اور نوع انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اُس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں، ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے (باقی)

بنتے ہیں یہ۔“ سلہ آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو ـــــ بجز اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی سلہ ـــــ
بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش سلہ، پھر دیکھو کہ اُن مجرموں کا کیا انجام ہوا۔ ع
اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا سلہ۔ اس نے کہا ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے

(بقیہ) ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی و محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت برے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر چرا لیتا ہے۔ ثالثاً وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھلی بد دیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھا لیتا ہے مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رساں ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نااہل بناتا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا کرتا ہے، اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) سلہ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بد کردار اور بد اخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انھیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ بدی میں یہاں تک غرق ہو چکے تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی کے اس تھوڑے سے عنصر کو بھی نکال دینا چاہتے تھے جو ان کی گھناونی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے استیصال کا فیصلہ صادر ہوا، کیونکہ جس قوم کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ سڑے ہوئے پھلوں کے ٹوکرے میں جب تک چند اچھے پھل موجود ہوں اس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جا سکتا ہے، مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں رہتا کہ اسے کسی گھوڑے پر الٹ دیا جائے۔

سلہ دوسرے مقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لوط کی یہ بیوی، جو غالباً اسی قوم کی بیٹی تھی، اپنے کافر رشتہ داروں کی ہمنوا رہی اور آخر وقت تک اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس لیے عذاب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو ہدایت فرما دی کہ اس عورت کو ساتھ نہ لیا جائے۔

سلہ بارش سے مراد یہاں پانی کی بارش نہیں بلکہ پتھروں کی بارش ہے جیسا کہ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ نیز یہ بھی قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کی بستیاں اُلٹ دی گئیں اور انھیں تلپٹ کر دیا گیا۔ اسی بنا پر حضرت عمر اور حضرت عثمان نے فیصلہ کیا کہ جو شخص عمل قوم لوط کا مرتکب ہو اس پر دیوار ڈھا دی جائے۔ اور ابن عباس، شعبی، زہری، مالک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا متفقہ فتویٰ یہ ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے۔ یہ دونوں سزائیں اُس سزا کے عین مطابق ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے اس فعل کے مجرموں کو دی۔

سلہ مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا مگر جزیرہ نمائے سینا (باقی)

سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آگئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو،[۱] اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے،[۲] اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو۔[۳] اور (زندگی کے) ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب کہ تم تھوڑے تھے پھر اللہ نے تمہیں بہت کر دیا، اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا، تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے،[۴] اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ "اے شعیب! ہم تجھے اور اُن

(بقیہ) کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہ راہ بحر احمر کے کنارے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گذرتے تھے۔

اہلِ مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات، جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے اور ان کا سلسلۂ نسب مدیان بن ابراہیم سے ملتا تھا، اس لیے ان کے متعلق یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان کو دینِ حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیب ہی کے ذریعہ سے پہنچی تھی۔ درحقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداءً وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت اُن کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی جیسی ظہورِ موسیٰ علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی۔ حضرت ابراہیم کے بعد پانچ سو سال تک مشرک و بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے، مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک شرک، دوسرے تجارتی معاملات میں بددیانتی۔ اور انہی دونوں چیزوں کی اصلاح کے لیے حضرت شعیب مبعوث ہوئے تھے۔

[۲] اس فقرے کی جامع تشریح اسی سورۂ اعراف (رکوع ۷) کے حواشی میں گذر چکی ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ حضرت شعیب کے اس قول کا اشارہ اس طرف ہے کہ دینِ حق اور اخلاقِ صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت و رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا، اب تم اسے اپنی اعتقادی گمراہیوں اور اخلاقی بداعمالیوں سے خراب نہ کرو۔

[۳] اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعی ایمان تھے۔ جیسا کہ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں، یہ دراصل بگڑے ہوئے مسلمان تھے اور اعتقادی و اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیب نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راستبازی اور دیانت میں ہونی چاہیے، اور تمہارا معیارِ خیر و شر اُن دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

[۴] یعنی ایمان لانے والوں اور نہ لانے والوں کے درمیان، کہ ان میں سے کون حق پر ہے اور کون خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتا ہے۔

لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا"۔ شعیب نے جواب دیا "کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے[۱]۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسی پر ہم نے اعتماد کرلیا۔ اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کردے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کرچکے تھے، آپس میں کہا "اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کرلی تو برباد ہوجاؤ گے"۔ مگر ہوا یہ کہ ایک ہلا دینے والی آفت نے ان کو آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیب کے جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے[۲]۔ اور شعیب یہ کہہ کر ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے برادرانِ قوم! میں نے اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب میں اُس قوم پر کیوں افسوس کروں جو قبولِ حق سے انکار کرتی ہے"[۳]۔

---

[۱] یہ فقرہ اسی معنی میں ہے جس میں ان شاء اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اور جس کے متعلق سورۂ کہف (رکوع ۳) میں ارشاد ہوا ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کروں گا بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا کروں گا۔ اس لیے کہ مومن، جو اللہ تعالیٰ کی سلطانی و بادشاہی کا اور اپنی بندگی و تابعیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہے، کبھی اپنے بل بوتے پر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں فلاں بات کرکے رہوں گا یا فلاں حرکت ہرگز نہ کروں گا، بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ میرا ارادہ ایسا کرنے یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مشیت پر موقوف ہے، وہ توفیق بخشے گا تو اس میں کامیاب ہو جاؤں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا۔

[۲] مدین کی یہ تباہی مدتہائے دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔ چنانچہ زبورِ داؤد میں ایک جگہ آتا ہے کہ "اے خدا، فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا۔ (۸۳ – ۵ تا ۹) اور یسعیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اشور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمہارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جاتے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا۔ (یسعیاہ: ۱۰ – ۲۴ تا ۲۶)

[۳] یہ جتنے قصے یہاں بیان کیے گئے ہیں ان سب میں "سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں" کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ہر قصہ اس معاملہ پر پورا پورا چسپاں ہوتا ہے جو اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان پیش آ رہا تھا۔ ہر قصہ میں ایک فریق نبی ہے جس کی تعلیم، جس کی دعوت، جس کی نصیحت و خیر خواہی، اور جس کی ساری باتیں بعینہٖ وہی ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں۔ اور دوسرا فریق حق سے منہ موڑنے والی قوم ہے جس کی اعتقادی گمراہیاں، جس کی اخلاقی خرابیاں، جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں، جس کے سرداروں کا استکبار، جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار، غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں پایا جاتا تھا۔ پھر ہر قصے میں منکر قوم کا جو انجام پیش کیا گیا ہے اس سے دراصل قریش کو عبرت دلائی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی بات نہ مانی اور اصلاحِ حال کا جو موقع تمھیں دیا جا رہا ہے اسے ضد میں مبتلا ہو کر کھو دیا تو آخر کار تمھیں بھی اسی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا جو ہمیشہ سے گمراہی و فساد پر اصرار کرنے والی قوموں کے حصے میں آتی رہی ہے۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو، اس خیال سے کہ شاید وہ عاجزی پر اُتر آئیں۔ پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ "ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے ہی رہے ہیں"۔ آخر کار ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔[۸۰] اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں

۸۰ ایک ایک نبی اور ایک ایک قوم کا معاملہ الگ الگ بیان کرنے کے بعد اب وہ جامع ضابطہ بیان کیا جا رہا ہے جو ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے موقع پر اختیار فرمایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی بھیجا گیا تو پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبولِ دعوت کے لیے بہت ساز گار بنایا گیا۔ یعنی اس کو مصائب اور آفات میں مبتلا کیا گیا، قحط، وبا، تجارتی خسارے، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں اس پر ڈالی گئیں تاکہ اس کا دل نرم پڑے، اس کی شیخی اور تکبر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو، اس کا غرورِ طاقت اور نشۂ دولت ٹوٹ جائے، اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر اس کا اعتماد شکست ہو جائے، اُسے محسوس ہو کہ اوپر کوئی اور طاقت بھی ہے جس کے ہاتھ میں اس کی قسمت کی باگیں ہیں، اور اس طرح اس کے کان نصیحت کے لیے کھل جائیں اور وہ اپنے خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ جھک جانے پر آمادہ ہو جائے۔ پھر جب اس ساز گار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو اس کو خوش حالی کے فتنہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور یہاں سے اس کی بربادی کی تمہید شروع ہو جاتی ہے جیسے وہ نعمتوں سے مالا مال ہونے لگتی ہے تو اپنے بُرے دن بھول جاتی ہے اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا اتار چڑھاؤ اور قسمت کا بناؤ اور بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی بُرے دن لاتی ہی رہتی ہے، لہٰذا مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کر کے خدا کے آگے زاری و تضرع کرنے لگنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ لا یزال البلاء بالمؤمن حتٰی یخرج نقیًّا من ذنوبہ، والمنافق مثلہ کمثل الحمار لا یدری فیم ربطہ اھلہ ولا فیم ارسلوہ۔ یعنی مصیبت مومن کی تو اصلاح کرتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ اس بھٹی سے نکلتا ہے تو ساری کھوٹ سے صاف ہو کر نکلتا ہے لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کے مالک نے کیوں اسے باندھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا۔ پس جب کسی قوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ نہ مصائب سے اس کا دل خدا کے آگے جھکتا ہے، نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے، اور نہ کسی حال میں اصلاح قبول کرتی ہے تو پھر اس کی بربادی اس طرح اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے جیسے پورے دن کی حاملہ عورت کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس ضابطہ کا ذکر فرمایا ہے ٹھیک یہی ضابطہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر بھی برتا گیا اور شامت نے وہ قوموں کے جس طرزِ عمل کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ٹھیک وہی طرزِ عمل سورۂ اعراف کے نزول کے زمانہ میں قریش والوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ حدیث میں عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس دونوں کی متفقہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب قریش کے لوگوں نے آپ کی دعوت کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا شروع کیا تو حضور نے دعا کی کہ خدایا یوسف کے زمانہ میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد کر۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت قحط میں مبتلا کر دیا اور نوبت (باقی)

کے دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُس بُری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔ پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوتے پڑے ہوں؟ یا انھیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال[٧٧] سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو۔ ع ۱۲

اور کیا اُن لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد زمین کے وارث ہوتے ہیں، اِس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انھیں پکڑ سکتے ہیں[٧٨]؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے[٧٩]۔ یہ قومیں جن کے قصے ہم تمھیں سنا رہے ہیں (تمھارے سامنے مثال میں موجود ہیں) ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو وہ ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے پھر اسے وہ ماننے والے نہ تھے۔ دیکھو اس طرح ہم منکرین حق کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں[٨٠]۔ ہم نے ان میں سے اکثر میں کوئی پاس عہد نہ پایا بلکہ اکثر کو فاسق

(بقیہ) یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ مردار کھانے لگے، چمڑے اور ہڈیاں اور اون تک کھا گئے۔ آخر کار مکہ کے لوگوں نے، جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا، حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے خدا سے دعا کیجیے۔ مگر جب آپ کی دعا سے اللہ نے وہ برا وقت ٹال دیا اور بھلے دن آئے تو ان لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں اور جن کے دل تھوڑے بہت پسیج گئے تھے ان کو بھی اشرار قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان سے روکنا شروع کر دیا کہ میاں یہ تو زمانے کا اُتار چڑھاؤ ہے، پہلے بھی آخر قحط آتے ہی رہے ہیں، کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، لہٰذا ان چیزوں سے دھوکا کھا کر محمدؐ کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ یہ تقریریں اس زمانے میں ہو رہی تھیں جب یہ سورۂ اعراف نازل ہوئی ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی یہ آیات ٹھیک اپنے موقع پر چسپاں ہوتی ہیں اور اسی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے ان کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [٧٧] اصل میں لفظ مَکر استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی زبان میں خفیہ تدبیر کے ہیں، یعنی کسی شخص کے خلاف ایسی چال چلنا کہ جب تک اس پر فیصلہ کن ضرب نہ پڑ جائے اس وقت تک اسے خبر نہ ہو کہ اس کی شامت آنے والی ہے، بلکہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ یہی سمجھتا رہے کہ سب اچھا ہے۔

[٧٨] یعنی ایک گرنے والی قوم کی جگہ جو دوسری قوم اٹھتی ہے اس کے لیے اپنی پیش رو قوم کے زوال میں کافی رہنمائی موجود ہوتی ہے۔ وہ اگر عقل سے کام لے تو سمجھ سکتی ہے کہ کچھ مدت پہلے جو لوگ اس جگہ داد عیش دے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا یہاں لہرا رہا تھا انھیں فکر و عمل کی کن غلطیوں نے برباد کیا، اور وہ بھی محسوس کر سکتی ہے کہ جس بالاتر اقتدار نے کل انھیں ان کی غلطیوں پر پکڑا تھا اور ان سے یہ جگہ خالی کرا لی تھی، وہ آج کہیں مٹ نہیں گیا ہے، نہ اس سے کسی نے یہ مقدرت چھین لی ہے کہ اس جگہ کے موجودہ ساکنین اگر وہی غلطیاں کریں جو سابق ساکنین کر رہے تھے تو وہ ان سے بھی اسی طرح جگہ خالی نہ کرا لے گا جس طرح اگلوں سے خالی کرائی تھی۔

[٧٩] یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرت ناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بھلاوے میں ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی انھیں سوچنے سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانون فطرت یہی ہے کہ جو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اُس کی بینائی تک (باقی)

ری پایا۔[۸۲]

پھر ان قوموں کے بعد (جن کا ذکر اوپر کیا گیا)، ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا[۸۳] مگر انھوں نے بھی ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا[۸۴]، پس دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

(بقیہ) آفتاب ہدایت کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی اور جو خود نہیں سننا چاہتا اسے پھر کوئی کچھ نہیں سنا سکتا۔

۸۱ پچھلی آیت میں جو ارشاد ہوا تھا کہ "ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے"، اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خود فرما دی ہے۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دلوں پر مہر لگانے سے مراد ذہن انسانی کا اس نفسیاتی قانون کی زد میں آ جانا ہے جس کی رو سے ایک مرتبہ جاہلی تعصبات یا نفسانی اغراض کی بنا پر حق سے منہ موڑ لینے کے بعد پھر انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے الجھاؤ میں الجھتا ہی چلا جاتا ہے اور کسی دلیل، کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل کے دروازے قبول حق کے لیے نہیں کھلتے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۸۲ "کوئی پاس عہد نہ پایا" یعنی کسی قسم کے عہد کا پاس بھی نہ پایا، نہ اس فطری عہد کا پاس جس میں پیدائشی طور پر ہر انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، نہ اس اجتماعی عہد کا پاس جس میں ہر فرد بشر انسانی برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے، اور نہ اس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مصیبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبہ خیر کے موقع پر خدا سے بطور خود باندھا کرتا ہے۔ انہی تینوں عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق قرار دیا گیا ہے۔

۸۳ اوپر جو قصے بیان ہوئے ان سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے اسے پھر ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کے بعد اب موسیٰ و فرعون اور بنی اسرائیل کا قصہ کئی رکوعوں تک مسلسل چلتا ہے جس میں اس مضمون کے علاوہ چند اور اہم سبق بھی کفار قریش، یہود اور ایمان لانے والے گروہ کو دیے گئے ہیں:۔

کفار قریش کو اس قصہ کے پیرایہ میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق اور باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے، اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی تو پوری تاریخ ہی اس بات پر گواہ ہے کہ وہ ایک نہ قوم بلکہ ایک فرد کی اقلیت سے شروع ہوتا ہے اور بغیر کسی سروسامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے، پھر بھی آخر کار وہی غالب آ کر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ داعی حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اس کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے، اور جب وہ کسی تنبیہ، کسی سبق آموز واقعے اور کسی روشن نشانی سے بھی اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انھیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے ان کو اس قصے میں دوہرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری اور مخالفین حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر پست ہمت نہ ہوں، اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر دل شکستہ نہ ہوں، اور دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے سامنے ان کی اپنی عبرتناک تاریخ پیش کر کے انھیں باطل پرستی کے برے نتائج پر متنبہ کیا گیا ہے اور اس پیغمبر پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو پچھلے پیغمبروں کے لائے ہوئے دین کو تمام آمیزشوں سے پاک کر کے پھر اس کی اصلی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ (باقی)

موسیٰ نے کہا " اے فرعون[۱] : میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لیکر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے[۲]"۔

فرعون نے کہا " اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر"۔

موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک وہ ایک جیتا جاگتا اژدہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا[۳]۔ ع۳

(بقیہ) سلہ نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، یعنی ان کو نہ مانا اور انھیں جادوگری قرار دے کر ٹالنے کی کوشش کی جس طرح کسی ایسے شعر کو جو شعریت کا مکمل نمونہ ہو تک بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اُڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفس شاعری اور ذوقِ شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے، اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے من جانب اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں اور جن کے متعلق کوئی صاحب عقل آدمی یہ گمان تک کر سکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہو سکتی ہیں، بلکہ جن کے متعلق خود فن سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دسترس سے بالاتر ہیں، ان کو سحر قرار دینا بھی نہ صرف ان نشانیوں کے ساتھ بلکہ عقل سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلم عظیم ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) سلہ لفظ فرعون کے معنی ہیں "سورج دیوتا کی اولاد"۔ قدیم اہل مصر سورج کو، جو ان کا مہادیو یا ربِّ اعلیٰ تھا، رَعْ کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رو سے کسی فرماں روا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رَعْ کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو۔ اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسرِ اقتدار آتا تھا، اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا، اور ہر فرماں روا جو تخت نشین ہوتا "فرعون" کا لقب اختیار کر کے باشندگانِ ملک کو یقین دلاتا کہ تمہارا ربِّ اعلیٰ یا مہادیو میں ہوں۔

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمسیس دوم تھا جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۲ ق م سے ۱۲۲۵ قبل مسیح تک رہا۔ اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ان آیات میں ذکر ہو رہا ہے منفتہ یا منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریک حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔

سلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس بھیجے گئے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی اپنے پنجۂ ظلم سے رہا کر دے۔ قرآن میں ان دونوں دعوتوں کا کہیں یکجا ذکر کیا گیا ہے اور کہیں موقع و محل کے لحاظ سے صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔

سلہ یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰ کو اس امر کے ثبوت میں دی گئی تھیں کہ وہ اس خدا کے نمائندے ہیں جو کائنات کا خالق اور فرماں روا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں، پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادہ ربّ العالمین کی حیثیت سے پیش کیا تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العالمین کے نمائندے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آنا چاہیے جو قوانینِ فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہو اور جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہو کہ ربّ العالمین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہِ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اسی مطالبہ کے جواب (باقی)

اس پر فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟ پھر ان سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھو اور تمام

(بقیہ) میں انبیا نے وہ نشانیاں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں آیات اور متکلمین کی اصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے۔ ایسے نشانات یا معجزات کو جو لوگ قوانین فطرت کے ماتحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا موقف اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس لیے کہ قرآن جہاں صریح طور پر خارقِ عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی جدوجہد محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے جس کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو اور دوسری طرف آبائی مذہب کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جو فی الواقع خارقِ عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظامِ کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطل ہوچکا ہے اور اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کرسکتا، یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اس کے احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیا کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے تغیر کردے؟ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے، کیونکہ معجزہ نہ ان کے تصورِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصورِ کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کردیں کیونکہ قرآن نے تو اپنا سارا زورِ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصور کا ابطال اور مؤخر الذکر تصور کا اثبات کرنے پر صرف کیا ہے۔ اور جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کرلے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ ہی یہ ہوگا کہ اژدہے جس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہوسکتے ہیں، اس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اژدہا پیدا کردینا خدا کی قدرت سے بھی باہر ہے، تو آپ مجبور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر جھٹلا دیں جو آپ کو خبر دے رہا ہو کہ ایک لاٹھی اژدہے میں تبدیل ہوتی اور پھر اژدہے سے لاٹھی بن گئی۔ لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادے کو جیسی چاہے زندگی عطا کرسکتا ہے، اس کے لیے خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے انڈے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادوں کا اژدہا بن جانا غیر عجیب ہے۔ مجرد یہ فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا، تو محض اس کے اس فعل سے اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہوجاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنتِ مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقہ سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کردے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جبکہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ یہ شخص پورے نظامِ زندگی کو بحیثیت مجموعی (باقی)

شہروں میں ہرکارے بھیج دے کہ ہر ماہر فن جادوگر کو لے آئیں[۱]۔ چنانچہ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔
انھوں نے کہا "اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟"
فرعون نے جواب دیا "ہاں! اور تم مقرب بارگاہ ہوگے"۔
پھر انھوں نے موسیٰ سے کہا "تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟"
موسیٰ نے جواب دیا "تم ہی پھینکو"۔
انھوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔
ہم نے موسیٰ کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے اس جھوٹے طلسم کو نگلتا

(بقیہ) تبدیل کر دینا چاہتا ہے جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطاع اور داعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہوگیا۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ کے اس دعوے کو ان لوگوں نے اتنی اہمیت ہی کیوں دی جبکہ آں حضرت کے ساتھ ایک بھائی کے سوا کوئی معاون و مددگار اور صرف ایک سانپ بن جانے والی لاٹھی اور ایک چمکنے والے ہاتھ کے سوا کوئی نشان ماموریت نہ تھا؟ تو میرے نزدیک اس کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے فرعون اور اس کے درباری خوب واقف تھے۔ ان کی پاکیزہ اور مضبوط سیرت، ان کی غیر معمولی قابلیت، اور قیادت و فرماں روائی کی پیدائشی صلاحیت کا سب کو علم تھا۔ تالمود اور یوسیفوس کی روایات اگر صحیح ہیں تو حضرت موسیٰ نے ان پیدائشی قابلیتوں کے علاوہ فرعون کے ہاں علوم و فنون اور حکمرانی و سپہ سالاری کی وہ پوری تعلیم و تربیت بھی حاصل کی تھی جو شاہی خاندان کے افراد کو دی جاتی تھی، اور زمانۂ شاہزادگی میں حبش کی مہم پر جاکر وہ اپنے آپ کو ایک بہترین جنرل بھی ثابت کر چکے تھے۔ پھر جو تھوڑی بہت کمزوریاں شاہی محلوں میں پرورش پانے اور فرعونی نظام کے اندر امارت کے مناصب پر سرفراز رہنے کی وجہ سے ان میں پائی جاتی تھیں، وہ بھی آٹھ دس سال مدین کے علاقہ میں صحرائی زندگی گزارنے اور بکریاں چرانے کی بدولت دور ہو چکی تھیں اور اب فرعونی دربار کے سامنے ایک پختہ سن رسیدہ و سنجیدہ فقیر کشورگیر نبوت کا دعویٰ لیے ہوئے کھڑا تھا جس کی بات کو بہرحال باد ہوائی سمجھ کر اڑایا نہ جاسکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ عصا اور ید بیضاء کی نشانیاں دیکھ کر فرعون اور اس کے درباری سخت مرعوب ہو چکے تھے اور ان کو تقریباً یقین ہوگیا تھا کہ یہ شخص فی الواقع کوئی فوق الفطری طاقت اپنی پشت پر رکھتا ہے۔ ان کا حضرت موسیٰ کو ایک طرف جادوگر بھی کہنا اور پھر دوسری طرف یہ اندیشہ بھی ظاہر کرنا کہ یہ ہم کو اس سرزمین کی فرماں روائی سے بے دخل کرنا چاہتا ہے، ایک صریح تضاد بیان تھا اور اس بوکھلاہٹ کا ثبوت تھا جو ان پر نبوت کے اس اولین مظاہرے سے طاری ہوگئی تھی۔ اگر حقیقت میں وہ حضرت موسیٰ کو جادوگر سمجھتے تو ہرگز ان سے کسی سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ کرتے کیونکہ جادو کے بل بوتے پر کبھی دنیا میں کوئی سیاسی انقلاب نہیں ہوا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] فرعونی درباریوں کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خدائی نشان اور جادو کے امتیازی فرق کا تصور بالکل واضح طور پر موجود تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خدائی نشان سے حقیقی تغیر واقع ہوتا ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو متاثر کر کے اشیاء میں (باقی)

چلا گیا۔ اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور فتح مند ہونے کے بجائے اُلٹے ذلیل ہو گئے۔ اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انھیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے "ہم نے مان لیا ربّ العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔"[۵۲]

فرعون نے کہا "تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمھیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا۔"

انھوں نے جواب دیا "بہرحال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ اور تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔ اے رب، ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔"[۵۳]

(بقیہ) ایک خاص طرح کا تغیر محسوس کرتا ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے حضرت موسیٰ کے دعوائے رسالت کو رد کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے یعنی عصا حقیقت میں سانپ نہیں بن گیا ہے کہ اسے خدائی نشانی مانا جائے، بلکہ صرف ہمیں ایسا نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا جیسا کہ ہر جادوگر کر لیتا ہے۔ پھر انھوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلایا جائے اور ان کے ذریعہ سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھا دیا جائے تاکہ عامۃ الناس کے دلوں میں اس معجزہ سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکلیہ دور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۱ یہ گمان کرنا صحیح نہیں ہے کہ عصا ان لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا جو جادوگروں نے پھینکی تھیں اور سانپ اور اژدہے بنی نظر آرہی تھیں۔ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ یہ ہے کہ عصا نے سانپ بن کر ان کے اُس طلسم فریب کو نگلنا شروع کر دیا جو انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانپ جدھر جدھر گیا وہاں سے جادو کا وہ اثر کافور ہوتا چلا گیا جس کی بدولت لاٹھیاں اور رسیاں سانپوں کی طرح لہراتی نظر آتی تھیں، اور اس کی ایک ہی گردش میں جادوگروں کی ہر لاٹھی، لاٹھی اور ہر رسّی، رسّی بن کر رہ گئی۔

۵۲ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی چال کو اُلٹا انہی پر پلٹ دیا۔ انھوں نے تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلا کر منظرِ عام پر اس لیے مظاہرہ کرایا تھا کہ عوام الناس کو حضرت موسیٰ کے جادوگر ہونے کا یقین دلائیں یا کم از کم شک ہی میں ڈال دیں۔ لیکن اس مقابلہ میں شکست کھانے کے بعد خود ان کے اپنے بلائے ہوئے ماہرینِ فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ یقیناً ربّ العالمین کی طاقت کا کرشمہ ہے جس کے آگے کسی جادو کا زور نہیں چل سکتا۔ ظاہر ہے کہ جادو کو ان لوگوں سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا۔ پس جب انھوں نے عملی تجربے اور آزمائش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ چیز جادو نہیں ہے، تو پھر فرعون اور اس کے درباریوں کے لیے باشندگانِ ملک کو یہ یقین دلانا بالکل ناممکن ہو گیا کہ موسیٰ محض ایک جادوگر ہے۔

۵۳ فرعون نے پانسہ پلٹتے دیکھ کر آخری چال یہ چلی تھی کہ اس سارے معاملہ کو موسیٰ اور جادوگروں کی سازش قرار دے دے اور پھر (باقی)

فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا "کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یونہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے؟" فرعون نے جواب دیا "میں ان کے بیٹوں کو قتل کرا دوں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے"۔

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔ اس کی قوم کے لوگوں نے کہا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں"۔ اس نے جواب دیا "قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ ع ۱۵

ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا کہ شاید ان کو ہوش آئے۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق ہیں، اور جب برا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو اپنے لیے فالِ بد ٹھیراتے، حالانکہ درحقیقت ان کی فالِ بد تو اللہ کے پاس تھی، مگر ان میں سے اکثر بے علم تھے۔ انھوں نے موسیٰ سے کہا کہ "تو ہمیں مسحور کرنے کے لیے خواہ کوئی نشانی لے آئے، ہم تو تیری بات ماننے والے نہیں"۔ آخرکار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے، اور خون برسایا، یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کیے

(بقیہ) جادوگروں کو جسمانی تعذیب اور قتل کی دھمکی دے کر ان سے اپنے اس الزام کا اقبال کرائے۔ لیکن یہ چال بھی الٹی پڑی اور جادوگروں نے اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ ان کا موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر ایمان لانا کسی سازش کا نہیں بلکہ سچے اعترافِ حق کا نتیجہ تھا۔ اب اس کے لیے کوئی چارہ کار اس کے سوا باقی نہ رہا کہ حق اور انصاف کا ڈھونگ جو وہ رچانا چاہتا تھا اسے چھوڑ کر صاف صاف ظلم و ستم شروع کر دے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ؎ واضح رہے کہ ایک دورِ ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانہ میں جاری ہوا تھا، اور دوسرا دورِ ستم یہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرایا گیا اور ان کی بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ غالباً اسی دور کا ہے وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران میں ملا تھا اور جس میں یہی فرعون منفتاح اپنے کارناموں اور فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا، اس کا بیج تک باقی نہیں"۔

؎ یہ انتہائی ہٹ دھرمی و دشمن پروری تھی کہ فرعون کے اہلِ دربار اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی بالیقین جانتے تھے کہ وہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی بے وقوف آدمی بھی یہ باور نہ کرے گا کہ ایک پورے ملک میں قحط پڑ جانا اور پیداوار میں مسلسل کمی واقع ہونا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید کہتا ہے کہ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل - ۱) یعنی "جب ہماری نشانیاں علانیہ ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے، مگر انھوں نے محض ظلم اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا"۔

؎ غالباً بارش کا طوفان مراد ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے لیکن بائیبل میں ژالہ باری کے طوفان ہی کا ذکر ہے اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ (باقی)

چلے گئے۔ اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ! تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر، اگر اب کے وہ ہم پر سے یہ بلا ٹال دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔" مگر جب ہم ان پر سے اپنا عذاب ایک وقت مقرر تک کے لیے، جس کو وہ بہر حال پہنچنے والے تھے، ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔ تب ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اُس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا[5]۔ اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ برباد کر دیا گیا جو وہ بناتے اور چڑھاتے تھے۔

بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے گذار دیا، پھر وہ چلے اور راستے میں ایک ایسی قوم پر ان کا گذر ہوا جو اپنے بتوں کی گرویدہ بنی ہوئی تھی۔ کہنے لگے، اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں[6]۔ موسیٰ نے کہا "تم لوگ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں وہ تو برباد ہونے والا ہے اور جو عمل وہ کر رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے۔" پھر موسیٰ نے کہا "کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود تمھارے لیے تلاش کروں حالانکہ وہ اللہ ہی ہے جس نے

(بقیہ) ۴ـــہ اصل میں لفظ قُمَّل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جوں، چھوٹی مکھی، چھوٹی ٹڈی، مچھر، سُرسُری وغیرہ۔ غالباً یہ جامع لفظ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جوؤں اور مچھروں نے آدمیوں پر اور سُرسُریوں (گھن کے کیڑوں) نے غلے کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵ـــہ یعنی بنی اسرائیل کو فلسطین کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم یہ لیا ہے کہ بنی اسرائیل خود سرزمین مصر کے مالک بنا دیے گئے۔ لیکن اس معنی کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تو قرآنِ کریم کے اشارات کافی واضح ہیں اور نہ تاریخ و آثار ہی سے اس کی کوئی قوی شہادت ملتی ہے، اس لیے اس معنی کو تسلیم کرنے میں ہمیں تأمل ہے۔

۶ـــہ بنی اسرائیل نے جس مقام سے بحر احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گذر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا میں جنوب کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقے میں موجودہ شہر طور اور ابوزنیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہل مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مفقہ کے مقام پر تھی جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نما کے جنوبی مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور اسی کے قریب ایک اور مقام تھا جہاں قدیم زمانے سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بُت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گذرتے ہوئے بنی اسرائیل کو، جن پر مصریوں کی غلامی نے مصریت زدگی کا اچھا خاصا گہرا ٹھپا لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

تمھیں دنیا بھر کی قوموں پر فضیلت بخشی ہے۔ اور (اللہ فرماتا ہے) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرعون والوں سے تمھیں نجات دی
جن کا حال یہ تھا کہ تمھیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمھارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے
ع۱۶ دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی۔"

ہم نے موسیٰ کو تیس شب و روز کے لیے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا، اس طرح اُس کے رب کی مقرر کردہ مدت پورے چالیس دن ہو گئی۔[۱] اس نے چلتے ہوئے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ "میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک کام کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔"[۲] جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ "اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں"۔ فرمایا "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا"۔ چنانچہ اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں"۔ فرمایا "اے موسیٰ میں نے تمام لوگوں پر ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہم کلام ہو۔ پس جو کچھ میں تجھے دوں اسے لے اور شکر بجا لا"۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر

۱؎ مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہو گئیں اور انھیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی تو حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ کوہ سینا پر طلب کیے گئے تاکہ انھیں بنی اسرائیل کے لیے شریعت عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی پہلی طلبی تھی، اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰ ایک پورا چلہ پہاڑ پر گزاریں اور روزے رکھ کر، شب و روز عبادت اور تفکر و تدبر کر کے اور دل و دماغ کو یکسو کر کے اس قول ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اُس مقام پر چھوڑا تھا جو موجودہ نقشے میں نبی صالح اور کوہ سینا کے درمیان وادی الشیخ کے نام سے موسوم ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحہ کہلاتا ہے۔ وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقے سے ہجرت کر کے تشریف لے آئے تھے، آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہو کر جا بیٹھے تھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر بادلوں سے ڈھنکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷,۳۵۹ فیٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر آج تک وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ نے چلہ کیا تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا ایک گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹینین کے زمانہ کی ایک خانقاہ آج تک آباد ہے۔ (باقی)

لکھ کر دے دیں[۱] اور اس سے کہا :-

"ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں[۲]۔ عنقریب میں تمھیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا[۳]۔ میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں[۴]، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہوگئے[۵]۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟" ع ۱۷

(بقیہ) ۳؎ حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ حضرت موسیٰ سے تین سال بڑے تھے لیکن کارِ نبوت میں حضرت موسیٰ کے ماتحت اور مددگار تھے۔ ان کی نبوت مستقل نہ تھی بلکہ حضرت موسیٰ نے خود اللہ تعالیٰ سے درخواست کرکے ان کو اپنے وزیر کی حیثیت سے مانگا تھا جیسا کہ آگے چل کر قرآن مجید میں تصریح بیان ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ توراۃ میں تصریح ہے کہ یہ دونوں تختیاں پتھر کی سلیں تھیں، اور ان تختیوں پر لکھنے کا فعل تورات اور قرآن دونوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم اس بات کا تعین کرسکیں کہ آیا ان تختیوں پر کتابت کا کام اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی قدرت سے کیا تھا، یا کسی فرشتے سے یہ خدمت لی تھی، یا خود حضرت موسیٰ کا ہاتھ استعمال فرمایا تھا۔

۲؎ یعنی احکام الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم جو عقل عام سے ہر وہ شخص سمجھ لے گا جس کی نیت میں فساد، یا جس کے دل میں ٹیڑھ نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی گئی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادھے الفاظ میں سے قانونی اینچ پینچ اور حیلوں کے راستے اور فتنوں کی گنجائشیں نکالتے ہیں، کہیں ان کی موشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے۔

۳؎ یعنی آگے چل کر تم لوگ ان قوموں کے آثارِ قدیمہ سے گزرو گے جنھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا اور غلط روی پر اصرار کیا۔ ان آثار کو دیکھ کر تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ ایسی روش اختیار کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔

۴؎ یعنی میرا قانونِ فطرت یہی ہے کہ ایسے لوگ کسی عبرت ناک چیز سے عبرت اور کسی سبق آموز شے سے سبق حاصل نہیں کر سکتے۔

"بڑا بننا" یا "تکبر کرنا" قرآن مجید اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھنے لگے اور خدا کے احکام کی کچھ پروا نہ کرے اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے گویا کہ نہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔ اس خود سری کی کوئی حقیقت ایک جھوٹا پندار غلط کے سوا نہیں ہے، کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے ایک بندے کو کسی طرح یہ حق پہنچتا ہی نہیں ہے کہ غیر بندہ بن کر رہے۔ اسی لیے فرمایا کہ "وہ بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں"۔

۵؎ ضائع ہوگئے، یعنی بار آور نہ ہوئے، غیر مفید اور لاحاصل نکلے، اس لیے کہ خدا کے ہاں انسانی سعی و عمل کے بار آور ہونے کا انحصار بالکل دو امور پر ہے۔ ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیشِ نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً حبطِ عمل واقع ہوگا۔ جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا ظاہر ہے کہ وہ خدا سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہو سکتا۔ اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لیے کیا اور (باقی)

موسیٰ کے پیچھے[۱] اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پُتلا بنایا جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی۔ کیا انھیں نظر نہ آتا تھا کہ وہ نہ ان سے بولتا ہے نہ کسی معاملہ میں ان کی رہنمائی کرتا ہے؟ مگر پھر بھی انھوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم[۲] تھے۔ پھر جب ان کی فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ درحقیقت وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے کہ "اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہم سے درگذر نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" اُدھر سے موسیٰ غصے اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کی طرف پلٹا۔ آتے ہی اس نے کہا "بہت بُری جانشینی کی تم لوگوں نے میرے بعد! کیا تم سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر لیتے؟" اور تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی (ہارون) کے سر کے بال پکڑ کر اسے کھینچا۔ ہارون نے کہا "اے میری ماں کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ پس تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور اس ظالم گروہ کے ساتھ مجھے نہ شامل کر۔"[۳] تب موسیٰ نے کہا "اے

(بقیہ) آخرت کے لیے کچھ نہ کیا، کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی امید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشاء کے خلاف تصرف کرتا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حق دار ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضہ کے زمانہ میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادہ کے ساتھ کیا ہو کہ جب تک اصل مالک اس کی جرأت بے جا سے اغماض کر رہا ہے اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا اور مالک کے قبضہ میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں غاصب کو اپنی زمین واپس لینے کے بعد میں زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصہ خواہ مخواہ اسے دوں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ یعنی ان چالیس دنوں کے دوران میں جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طلبی پر کوہِ سینا گئے ہوئے تھے اور یہ قوم پہاڑ کے نیچے میدان الواحہ میں ٹھیری ہوئی تھی۔

۲؎ یہ اس مصریت زدگی کا دوسرا ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا اس سے یہ قوم اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہو چکی تھی کہ قرآن کہتا ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ، یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا بس کر رہ گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گذرے تھے، سمندر کا پھٹنا، فرعون کا غرق ہونا، ان لوگوں کا بخیریت اُس بندِ غلامی سے نکل آنا جس کے ٹوٹنے کی کوئی امید نہ تھی، اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے، اور انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے، کسی دوسرے کی طاقت و تصرف کا اس میں کچھ دخل نہ تھا، مگر اس پر بھی انھوں نے پہلے تو پیغمبر سے ایک مصنوعی خدا طلب کیا، اور پھر پیغمبر کے پیٹھ موڑتے ہی خود ایک مصنوعی خدا بنا ڈالا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر بعض انبیاء بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو ملامت کرتے ہوئے طعنہ دیا تھا کہ اے اسرائیل، تو تو اس چھنال عورت کی طرح ہے جس نے پہلی ہی شب کو اپنے شوہر سے بے وفائی کی۔

۳؎ یہاں قرآن مجید نے ایک بہت بڑے الزام سے حضرت ہارون کی براءت ثابت کی ہے جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا تھا۔ موجودہ محرف توراۃ میں بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارون سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبود بنا دو، اور حضرت ہارون نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اُٹھے کہ اے اسرائیل یہی تیرا وہ خدا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے۔ پھر حضرت ہارون نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے (باقی)

رب بجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما کہ تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔" (جواب میں ارشاد ہوا ع ۸
کہ) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل
ہوں گے، جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ برے عمل کریں پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں
تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔"

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اٹھالیں جن کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی اُن لوگوں کے لیے
جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور اُس نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (اس کے ساتھ) ہمارے مقرر
کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں[۱]۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار!
آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم
سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا
کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں[۲]۔ ہمارے سرپرست تو آپ ہی ہیں پس ہمیں معاف کر دیجیے اور ہم پر رحم

(بقیہ) دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے آگے قربانیاں چڑھائیں (خروج۔ باب ۳۲۔ آیت ۱-۶) قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بصراحت
اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقت واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب خدا کا نبی ہارون نہیں بلکہ خدا کا باغی سامری تھا۔

بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو بھی انھوں نے داغدار کیے بغیر نہیں چھوڑا
ہے، اور داغ بھی ایسے سخت لگائے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں، مثلاً شرک، جادوگری، زنا، جھوٹ، دغابازی اور ایسے ہی
دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود نہایت عجیب ہے لیکن
بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی
انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گذر کر ان کے خواص تک کو حتیٰ کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب داروں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہا
لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے۔ اور وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے، انھوں نے انبیاء علیہم السلام
کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں
سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب اخلاقی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی، رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی، غرض
جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے اُن سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تار کول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی ایسی عظیم
الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم معمولی فانی انسان ان میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں، اور پھر جب یہ افعال اتنے اونچے مرتبے والوں
کے لیے بھی شرمناک نہیں ہیں تو ہمارے لیے کیوں ہوں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اس غرض کے لیے ہوئی تھی کہ قوم کے ۷۰ نمائندے کوہ سینا پر پیشی خداوندی میں حاضر ہو کر قوم کی طرف سے
گوسالہ پرستی کے جرم کی معافی مانگیں اور ازسرِ نو اطاعت کا عہد استوار کریں۔ اس واقعہ کا ذکر موجودہ محرف تورات میں نہیں پایا جاتا۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ ہر آزمائش کا موقع انسانوں کے درمیان فیصلہ کن ہوتا ہے، وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں کارآمد آدمیوں اور ناکارہ (باقی)

فرمائیے، آپ سب سے بڑھ کر معاف فرمانے والے ہیں۔ اور ہمارے لیے اس دنیا کی بھلائی بھی لکھ دیجیے اور آخرت کی بھی، ہم نے آپ کی طرف رجوع کر لیا۔" جواب میں ارشاد ہوا "سزا تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے،[لہ] اور اُسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے"۔

(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں[سلہ] جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے[سلہ]۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام

(بقیہ) آدمیوں کو چھانٹ کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا عین مقتضیٰ ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے رہیں، اور ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ ہی کی توفیق و رہنمائی سے پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اس توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کی بدولت ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی طرف سے توفیق اور رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو سراسر حکمت اور عدل پر مبنی ہے لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمائش کے مواقع پر کامیابی کی راہ پانا یا نہ پانا اللہ کی توفیق و ہدایت پر منحصر ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) لہ یعنی اللہ تعالیٰ جس طریقے پر خدائی کر رہا ہے اس میں اصل چیز غضب نہیں ہے جس میں کبھی کبھی رحم اور فضل کی شان نمودار ہو جاتی ہو، بلکہ رحم اصل ہے جس پر سارا نظام عالم قائم ہے اور اس میں غضب صرف اس وقت نمودار ہوتا ہے جب بندوں کا تمرد حد سے فزوں ہو جاتا ہے۔

سلہ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب اوپر کے فقرے پر ختم ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً بنی اسرائیل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے لیے جو شرائط موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں ہی آج تک قائم ہیں اور دراصل یہ انہی شرائط کا تقاضا ہے کہ تم اس پیغمبر پر ایمان لاؤ۔ تم سے کہا گیا تھا کہ خدا کی رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے جو نافرمانی سے پرہیز کریں، تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبر کو خدا نے مامور کیا ہے اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے، لہٰذا جب تک اس نافرمانی سے پرہیز نہ کرو گے تقویٰ کی جڑ ہی سرے سے قائم نہ ہوگی خواہ جزئیات و فروعات میں تم کتنا ہی تقویٰ بگھارتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمتِ الٰہی سے حصہ پانے کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے، تو آج کسی انفاقِ مال پر اس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آسکتی جب تک اقامتِ دینِ حق کی اُس جدوجہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہی ہے، لہٰذا جب تک اس راہ میں مال صرف نہ کرو گے زکوٰۃ کی بنیادی استوار نہ ہوگی چاہے تم کتنی ہی خیرات اور نذر و نیاز کرتے رہو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لائیں، تو آج جو آیات اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں ان کا انکار کر کے تم کسی طرح بھی آیاتِ الٰہی کے ماننے والے قرار نہیں پا سکتے، لہٰذا جب تک ان پر ایمان نہ لاؤ گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہوگی خواہ توراۃ پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرتے رہو۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "اُمّی" کا لفظ بہت معنی خیز استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری قوموں کو اُمّی (Gentile) کہتے تھے اور ان کا قومی فخر و غرور کسی اُمّی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار، اس پر بھی تیار نہ تھا کہ اُمیوں کے لیے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن ہی میں آتا ہے کہ وہ کہتے تھے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (آل عمران – ۸) یعنی اُمیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی اُمّی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے، اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لیے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آ رہے ہو۔

کرتا ہے[113]، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے[114]۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ ع۱۹

اے محمد! کہو کہ "اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے، اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہِ راست پا لوگے"۔

موسیٰ[115] کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا[116]۔ اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی[117]۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اس کو اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر

(بقیہ) [112] مثال کے طور پر توراۃ اور انجیل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں: استثناء، باب ۱۸، آیت ۱۵ تا ۱۹۔ متی، باب ۲۱، آیت ۳۳ تا ۴۶۔ یوحنا، باب ۱، آیت ۱۹ تا ۲۷۔ یوحنا، باب ۱۴، آیت ۱۵ تا ۱۷، و آیت ۲۵ تا ۳۰۔ یوحنا، باب ۱۵، آیت ۲۵-۲۶۔ یوحنا، باب ۱۶، آیت ۷ تا ۱۵۔

(حواشی صفحہ ہذا) [113] یعنی جن پاک چیزوں کو انھوں نے حرام کر رکھا ہے انہیں حلال قرار دیتا ہے، اور جن ناپاک چیزوں کو یہ لوگ حلال کیے بیٹھے ہیں انہیں وہ حرام قرار دیتا ہے۔

[114] یعنی ان کے فقیہوں نے اپنی قانونی موشگافیوں سے، ان کے روحانی مقتداؤں نے اپنے تورّع کے مبالغوں سے اور ان کے جاہل عوام نے اپنے توہمات اور خود ساختہ حدود و ضوابط سے ان کی زندگی کو جن بوجھوں تلے دبا رکھا ہے اور جن جکڑبندیوں میں کس رکھا ہے، یہ پیغمبر وہ سارے بوجھ اتار دیتا ہے اور وہ تمام بندشیں توڑ کر زندگی کو آزاد کر دیتا ہے۔

[115] اصل سلسلہ کلام بنی اسرائیل سے متعلق چل رہا تھا۔ بیچ میں موقع کی مناسبت سے، رسالتِ محمدی پر ایمان لانے کی دعوت بطور جملۂ معترضہ کے آگئی۔ اب پھر تقریر کا رخ اسی مضمون کی طرف پھر رہا ہے جو پچھلے کئی رکوعوں سے بیان ہو رہا تھا۔

[116] بیشتر مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا ہے جو حق کے مطابق ہدایت اور انصاف کرتا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کی وہ اخلاقی و ذہنی حالت بیان کی گئی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ لیکن سیاق و سباق پر نظر کرتے ہوئے ہم اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہ حال بیان ہوا ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھا، اور اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب اس قوم میں گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا گیا اور حضرتِ حق کی طرف سے اس پر گرفت ہوئی تو اس وقت ساری قوم بگڑی ہوئی نہ تھی بلکہ اس میں ایک اچھا خاصا صالح عنصر بھی موجود تھا۔

[117] اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اُس تنظیم کی طرف جو سورۂ مائدہ رکوع ۳ میں بیان ہوئی ہے اور جس کی پوری تفصیل بائیبل کی کتاب گنتی میں ملتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی، پھر ان کے ۱۲ گھرانوں کو جو حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے الگ الگ گروہوں کی شکل میں منظم کیا، اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکام شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوب کے بارھویں بیٹے لاوی کی اولاد کو ایک الگ گروہ کی شکل میں منظم کیا۔ تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمع حق روشن رکھنے کی خدمت انجام دیتا رہے۔ (باقی)

اپنی لاٹھی مارو، چنانچہ اس سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ متعین کر لی۔ ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلویٰ اتارا [۷۳] ۔۔۔ کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو بخشی ہیں، مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے۔

یاد کرو وہ وقت [۷۴] جب ان سے کہا گیا تھا کہ "اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ کہتے جاؤ اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو، ہم تمھاری خطائیں معاف کریں گے اور نیک رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے"۔ مگر جو لوگ ان میں سے ظالم تھے انھوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا [۷۵]۔ ع ۲۰

اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی [۷۶]۔ انھیں یاد دلاؤ وہ واقعہ کہ وہاں کے لوگ سبت کے

(بقیہ) یعنی منجملہ ان احسانات کے بھی جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ اس کے بعد تین مزید احسانات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ نمائے سینا کے بیابانی علاقے میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کو دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل چھا دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من و سلویٰ کے نزول کی شکل میں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر ان تین اہم ترین ضروریات زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی، اس علاقہ میں بھوک پیاس سے بالکل ختم ہو جاتی۔ آج بھی کوئی شخص وہاں جائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اگر یہاں چھ سات لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آ ٹھیرے تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سایے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں پانچ چھ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے مدبرّین کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین نے، جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا کے اُس حصہ سے گذرے ہوں گے جس کا ذکر توراۃ اور قرآن میں ہوا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابل تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گذر سکتی تھی خصوصاً جبکہ مصر کی طرف سے اس کی رسد کا راستہ بھی منقطع تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔

ان امور کو پیش نظر رکھنے سے صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر بھی یہ قوم مسلسل نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۷۳] یہ تینوں واقعات اس زمانے میں پیش آئے تھے جب کہ بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں مہاجرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ چٹان جس سے چشمے نکلے تھے کوہ سینا کے بیابان میں اب تک موجود ہے اور سیاح آج اسے دیکھتے ہیں۔ اسی علاقہ میں من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا اور بنی اسرائیل کی مہاجرت کے دوران میں برابر اس وقت تک جاری رہا جب تک انھوں نے خود شہری غذاؤں کے لیے تقاضا نہ کیا، اور اسی علاقہ میں بادل کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کے لیے سایہ کا انتظام کیا گیا جس کا ذکر توراۃ میں بھی کسی قدر مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

[۷۴] اب تاریخ بنی اسرائیل کے ان واقعات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مذکورۂ بالا احسانات (باقی)

دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن اُبھر اُبھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں[120]۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے[121]۔ اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب اُن میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے، تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمھارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں"۔ آخرکار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا[122]۔ پھر جب وہ پوری سرکشی کے ساتھ وہی کام کیے چلے گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا، تو ہم نے کہا کہ بندر ہو جاؤ

(بقیہ) کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں کے ساتھ دیتے رہے اور پھر کس طرح مسلسل تباہی کے گڑھے میں گرتے چلے گئے۔

۱۱۸ اس کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ رکوع ۶ کے حواشی ملاحظہ ہوں۔

۱۱۹ تحقیق کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ یا ایلات تھا جس کے قریب آج کل عقبہ کا مشہور مقام واقع ہے۔ اس کی جائے وقوع بحرِ قلزم کی اُس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے شرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔

جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کی کتب مقدسہ میں کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا اور ان کی تاریخیں بھی اس باب میں خاموش ہیں، مگر قرآن مجید میں جس انداز سے اس واقعہ کو یہاں اور سورۂ بقرہ میں بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے دور میں بنی اسرائیل بالعموم اس واقعہ سے خوب واقف تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیتے تھے، قرآن کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۲۰ "سبت" ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے، گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے، جانوروں اور لونڈی غلاموں تک سے کوئی خدمت نہ لی جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی حتیٰ کہ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں (جو ۶۲۸ء اور ۵۸۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال اسباب لے کر گزرتے تھے جس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذرِ آتش کر دیا جائے گا (یرمیاہ ۱۷: ۲۱-۲۷)۔ اسی کی شکایت حزقی ایل نبی بھی کرتے ہیں جن کا دور ۵۹۵ء اور ۵۳۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرا ہے، چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا گیا ہے (حزقی ایل ۲۰: ۱۲-۲۴)۔ ان حوالوں سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید یہاں جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہے وہ بھی غالباً اسی دور کا واقعہ ہوگا۔

۱۲۱ اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لیے جو طریقے اختیار فرماتا ہے ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا گروہ کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اس کے وہ میلانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغدار کرنا چاہتا ہے ان سے وہ صرف اس لیے (باقی)

(بقیہ) باز نہ رہ جائے کہ ان کے ارتکاب کے مواقع اُسے نہ مل رہے ہوں۔

۱۲۳ اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس بستی میں تین قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک وہ جو دھڑلے سے احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہتے تھے کہ ان کمبختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ تیسرے وہ جن کی غیرتِ ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہِ راست پر آجائیں اور اگر وہ راہِ راست نہ اختیار کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی براءت کا ثبوت پیش کر ہی دیں۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا تو قرآن مجید کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ ہی اس سے بچایا گیا کیونکہ اُسی نے خدا کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی براءت کا ثبوت فراہم کر رکھا تھا۔ باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے۔

بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کے مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات پانے کی تصریح کی ہے لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے۔ پھر ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے تھا، بعد میں ان کے شاگرد عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا۔ لیکن قرآن کے بیان پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس کا پہلا خیال ہی صحیح تھا۔ ظاہر ہے کہ کسی بستی پر خدا کا عذاب آنے کی صورت میں تمام بستی دو ہی گروہوں میں تقسیم ہو سکتی ہے، ایک وہ جو عذاب میں مبتلا ہو اور دوسرا وہ جو بچا لیا جائے۔ اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق بچنے والا گروہ صرف تیسرا تھا، تو لامحالہ پہلے اور دوسرے گروہ دونوں نہ بچنے والوں میں شامل ہوں گے۔ اسی کی تائید مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ کے فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کی توضیح بعد کے فقرے میں خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری قابلِ مواخذہ ہوتی ہے اور کوئی شخص محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس بات کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک اصلاح اور اقامتِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ پھر قرآن اور حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ہم کو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (ڈرو اس فتنہ سے جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہیں ہوں گے جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو) اور اس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذٰلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ۔ یعنی اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہارِ ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہارِ ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مزید براں جو آیات اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذابٍ بئیس (سخت عذاب) فرمایا گیا ہے، اور دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی پر اصرار کرنے والوں کو بندر بنا دیا گیا۔ ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ پہلی قسط کے عذاب میں پہلے دونوں گروہ شامل تھے، اور دوسری قسط کا عذاب صرف پہلے گروہ کو دیا گیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ ان اصبتُ فمن اللہ وان اخطأتُ فمن نفسی، واللہ غفور رحیم۔

ذلیل اور خوار۔

اور یاد کرو جبکہ تمہارے ربّ نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے، یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے اور یقیناً وہ درگزر اور رحم سے بھی کام لینے والا ہے۔

ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتابِ الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر وہی متاعِ دنیا پھر سامنے آئے تو پھر اسے لپک کر لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو حق ہو؟ اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ آخرت کی قیام گاہ تو خدا ترس لوگوں کے لیے ہی بہتر ہے، کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم رکھی ہے، یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا

[illegible] اس کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ رکوع ۸ کے حواشی ملاحظہ ہوں۔

[illegible] اصل میں لفظ تاذّن استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو نوٹس دینے یا خبردار کر دینے کا ہے۔

[illegible] یہ تنبیہ بنی اسرائیل کو تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح سے مسلسل کی جا رہی تھی، چنانچہ یہودیوں کے مجموعۂ کتب مقدسہ میں یسعیاہ اور یرمیاہ اور ان کے بعد کے آنے والے انبیاء کی تمام کتابوں میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہی مضمون ہمیں ملتا ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی اور یہ بات قرآن اور اس سے پہلے کے صحیفوں کی صداقت پر ایک بین شہادت ہے کہ اُس وقت سے لے کر آج تک تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہودی قوم دنیا میں کہیں نہ کہیں روندی اور پامال نہ کی جاتی رہی ہو۔

[illegible] یعنی گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر اس بھروسے پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور خواہ ہم کچھ ہی کریں بہرحال ہماری مغفرت ہونی ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بد نصیب لوگ! اُس کتاب کے وارث ہوئے جو ان کو دنیا کا امام بنانے والی تھی، مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخۂ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاعِ حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل و راستی کے علمبردار اور خیر و صلاح کے رہنما بنتے، محض دنیا کے کتے بن کر رہ گئے۔

[illegible] یعنی یہ خود جانتے ہیں کہ توراۃ میں کہیں بھی بنی اسرائیل کے لیے نجاتِ غیر مشروط کا پروانہ کا ذکر نہیں ہے۔ نہ خدا نے کبھی ان سے یہ کہا اور نہ اس کے پیغمبروں نے کبھی ان کو یہ اطمینان دلایا کہ تم جو چاہو کرتے پھرو بہرحال تمہاری مغفرت ضرور ہو گی۔ پھر آخر انہیں کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خود خدا نے کبھی نہیں کہی حالانکہ ان سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ خدا کے نام سے کوئی بات خلافِ حق نہ کہیں گے۔

[illegible] اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ہم نے متن میں اختیار کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "خدا ترس لوگوں کے لیے تو آخرت کی قیام گاہ ہی بہتر ہے"۔ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہو گا کہ مغفرت کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمہیں آخرت میں جگہ مل جائے بھی محض اس لیے کہ تم یہودی یا اسرائیلی ہو۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہو تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ آخرت میں اچھا مقام صرف انہی لوگوں کو (باقی)

اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔ انھیں وہ وقت بھی کچھ یاد ہے جبکہ ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان پر اس طرح چھا دیا تھا کہ گویا وہ چھتری ہے اور یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر آ پڑے گا اور اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہو گے۔[۱۳۲] ع ۲۱

اور[۱۳۳] اے نبی لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمھارے ربّ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا "کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں"؟ انھوں نے کہا "ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں"۔[۱۳۴] یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"، یا یہ نہ کہنے لگو کہ "شرک کی ابتدا تو

(بقیہ) ہو سکتا ہے جو دنیا میں خدا ترسی کے ساتھ کام کریں۔ رہا دوسرا ترجمہ تو اس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ دنیا اور اس کے فائدوں کو آخرت پر ترجیح دینا تو صرف ان لوگوں کا کام ہے جو نا خدا ترس ہوں، خدا ترس لوگ تو لازماً دنیا کی مصلحتوں پر آخرت کی مصلحت کو اور دنیا کے عیش پر آخرت کی بھلائی کو ترجیح دیتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۳۲] اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو موسیٰ علیہ السلام کو تختیاں (غالباً دوسری مرتبہ) عطا کیے جانے کے موقع پر کوہ سینا کے دامن میں پیش آیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کتاب کی پابندی کا عہد لیا تھا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ان پر ایسا ماحول طاری کر دیا تھا جس سے انھیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اس کے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہ کائنات کے ساتھ میثاق استوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں۔ اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انھیں زبردستی خوف زدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہل ایمان تھے اور دامن کوہ میں میثاق باندھنے ہی کے لیے گئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و اقرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے تاکہ اقرار کرتے وقت انھیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادر مطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ بد عہدی کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر بنی اسرائیل سے خطاب ختم ہو جاتا ہے اور بعد کے رکوعوں میں تقریر کا رُخ عام انسانوں کی طرف پھرتا ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ روئے سخن اُن لوگوں کی جانب ہے جو براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے

[۱۳۳] اوپر کا سلسلۂ بیان اس بات پر ختم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بندگی و اطاعت کا عہد لیا تھا۔ اب عام انسانوں کی طرف خطاب کر کے انھیں بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، درحقیقت تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمھیں ایک روز جواب دہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی۔

[۱۳۴] جیسا کہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ تخلیق آدم کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسان اول کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا، اسی طرح پوری نسل آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابی بن کعب نے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔ (باقی)

ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا؟ سلہ

(بقیہ) "اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انہیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں آپ اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھیراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا۔ میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے، آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔"

اس معاملہ کو بعض لوگ محض تمثیلی انداز بیان پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل یہاں قرآن مجید صرف یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار انسانی فطرت میں پیوست ہے، اور اس بات کو یہاں ایسے انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا یہ ایک واقعہ تھا جو عالم خارجی میں پیش آیا۔ لیکن ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں میں اسے بالکل ایک واقعہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور صرف بیان واقعہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کے روز بنی آدم پر حجت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد و اقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے محض ایک تمثیلی بیان قرار دیں۔ ہمارے نزدیک یہ واقعہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان تمام انسانوں کو جنہیں وہ قیامت تک پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، بیک وقت زندگی اور شعور اور گویائی عطا کر کے اپنے سامنے حاضر کیا تھا، اور فی الواقع انہیں اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا کوئی رب اور کوئی الٰہ اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے سوا نہیں ہے اور ان کے لیے کوئی صحیح طریق زندگی اس کی بندگی و فرماں برداری (اسلام) کے سوا نہیں ہے۔ اس اجتماع کو اگر کوئی شخص بعید از امکان سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقت میں تو نسل انسانی کی موجودہ تدریجی پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی ظہور، اور ابد میں ان کا مجموعی حشر و نشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحب عقل و شعور اور صاحب تصرف و اختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت سے آگاہی بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار (Oath of allegiance) لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابل تعجب نہیں، البتہ اگر یہ پیش نہ آتا تو ضرور قابل تعجب ہوتا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) سلہ اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسل آدم سے یہ اقرار لیا گیا تھا، اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں، انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں۔ گویا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوع انسانی میں سے ہر ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہ واحد اور رب واحد ہونے کی شہادت (باقی)

(بقیہ) اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکلیہ بری ہو سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغاز آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے الستُ بربکم کا سوال ہوا تھا اور اس نے بلیٰ کہا تھا؟ اگر نہیں تو پھر اُس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد پھر آزمائش و امتحان کے کوئی معنی باقی نہ رہ جاتے۔ لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور (Sub-Conscious mind) اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے اور اس کا حال بھی وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری و وجدانی علوم کا حال ہے۔ تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوہ (Potentially) موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوہ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخلی تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی جو اس کے اندر بالقوہ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا [illegible] کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب موثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوہ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں، لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تسخیات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے:

وہ سب ہمارے اندر بالقوہ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کو ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی)، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوہ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر، پردہ ڈال کر، منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی (Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اُس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت، اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجو[illegible]ے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی [illegible] میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی، ہر پشت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں [illegible] ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

(باقی)

دیکھو، اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں[۱۵۸] اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں[۱۵۹]

اور اے محمد! ان کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو[۱۶۰] جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ اُن کی پابندی سے نکل بھاگا پھر شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا حتیٰ کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی

(بقیہ) اُس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیا علیہم السلام اور کتب سماوی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیان حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے ان کو قرآن میں مذکِّر (یاد دلانے والے) ذکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفس انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورت لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا۔

پھر اسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشات نفس اور تعصبات اور شیاطین جن و انس کی گمراہ کن تعلیمات و ترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی و عملی فساد رونما ہوتا رہا ہے لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوح دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر و تجدید کی کوششیں اسے ابھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہو گا اس روز ان کا خالق ان کے شعور و حافظہ میں روز ازل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جبکہ انھوں نے اُس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا، پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا، اور یہ بھی ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علی رؤس الاشہاد دکھا دے گا کہ انھوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اٹھیں، اپنی اور اپنے گرد و پیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیان حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ ابھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصبات اور اپنی خواہشات نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کرتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہو گا بلکہ صاف صاف اقرار جرم کا ہو گا، اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے یا غافل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا، وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱۵۸] اس کا مطلب یہ ہوا کہ معرفت حق کے یہ نشانات انسان کے اپنے نفس میں موجود ہیں اور ان کی یہ صاف صاف نشان دہی جو کر دی گئی ہے اس کے بعد اگر کوئی شخص اپنے اندر آنکھیں کھول کر دیکھے تو وہ اسے اچھی طرح نظر آ سکتے ہیں۔ (باقی)

کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے؎ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔
تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔ بڑی ہی بُری مثال ہے ایسے لوگوں کی جنھوں نے ہماری

(بقیہ) ؎ یعنی بغاوت و انحراف کی روش چھوڑ کر بندگی و اطاعت کے رویہ کی طرف واپس ہوں۔

؎ ان الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ضرور کوئی متعین شخص ہوگا جس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی یہ انتہائی اخلاقی بلندی ہے کہ وہ جب کبھی کسی کی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اس کی رسوائی کیے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ اسی لیے نہ قرآن میں بتایا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں کہ وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، کون تھا۔ مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کیا ہے۔ کوئی بلعم بن باعوراء کا نام لیتا ہے کوئی امیہ بن ابی الصلت کا، اور کوئی صیفی ابن الراہب کا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردہ میں ہے جو اس تمثیل میں پیشِ نظر تھا، البتہ یہ تمثیل ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ ان دو مختصر سے فقروں میں بڑا اہم مضمون ارشاد ہوا ہے جسے ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

وہ شخص جس کی مثال یہاں پیش کی گئی ہے، آیاتِ الٰہی کا علم رکھتا تھا یعنی حقیقت سے واقف تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اُس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرزِ عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ صحیح ہے۔ اسی عمل مطابقِ علم کی بدولت اللہ تعالیٰ اس کو انسانیت کے بلند مراتب پر ترقی عطا کرتا۔ لیکن وہ دنیا کے فائدوں، اور لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک پڑا، خواہشاتِ نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس نے ان کے آگے سپر ڈال دی، معالی امور کی طلب میں دنیا کی حرص و طمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص و طمع سے ایسا مغلوب ہوا کہ اپنے سب اونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو طلاق دے بیٹھا اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگا جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اس کا علم کر رہا تھا۔ پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر [illegible] سے منہ موڑ کر بھاگا تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا تھا، اُس کے پیچھے لگ گیا اور برابر اسے ایک پستی سے دوسری پستی کی طرف لے جاتا رہا یہاں تک کہ ظالم نے اسے ان لوگوں کے زمرے میں پہنچا کر ہی دم لیا جو اس کے دام میں پھنس کر پوری طرح اپنی متاعِ عقل و ہوش گُم کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کی حالت کو کتے سے تشبیہ دیتا ہے جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتشِ حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے۔ بنائے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اردو زبان میں ایسے شخص کو جو دنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو، دنیا کا کتا کہتے ہیں۔ کتے کی جبلت کیا ہے؟ حرص و آز۔ چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جائے۔ اسے پتھر مار دیجیے تب بھی اس کی یہ توقع دور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو پھینکی گئی ہے کوئی ہڈی یا روٹی کا کوئی ٹکڑا ہو۔ پیٹ کا بندہ ایک دفعہ تو اسے بھی لپک کر دانتوں میں پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجیے تب بھی وہ لالچ کا مارا توقعات کی ایک دنیا دل میں لیے، زبان لٹکائے، ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو، جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دے گا۔ اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ ہے شہوتِ فرج۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے اور اسی کو سونگھنے

آیات کو جھٹلایا اور وہ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کرتے رہے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت بخشے بس وہی راہ راست پاتا ہے اور جس کو اللہ اپنی رہنمائی سے محروم کر دے وہ ناکام و نامراد ہو کر رہتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔۱۴۰ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں۔

اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔۱۴۲ ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہدایت اور

(بقیہ) اور چاٹنے میں مشغول رہتا ہے۔ پس تشبیہ کا مدعا یہ ہے کہ دنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھوں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا، ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شرمگاہ۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۴۰ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے ان کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں اور ان کو وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ انہیں دوزخ کا ایندھن بنانا ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا دل، دماغ، آنکھیں اور کان دے کر، مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہ لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخرکار جہنم کا ایندھن بن کر رہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے وہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جو انسانی زبان میں انتہائی افسوس اور حسرت کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی ماں کے متعدد جوان جوان بیٹے لڑائی میں جا کر لقمۂ اجل ہو گئے ہوں تو وہ لوگوں سے کہتی ہے کہ میں نے انہیں اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ وہ بے دردی کے ساتھ آگ کے کھیل میں ختم ہو جائیں۔ اس قول سے اس کا مدعا یہ نہیں ہوتا کہ واقعی اس کے پالنے پوسنے کی غرض یہی تھی، بلکہ اس حسرت بھرے انداز میں دراصل وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں نے تو اتنی محنتوں سے اپنا خون جگر پلا پلا کر ان بچوں کو پالا تھا، مگر خدا ان لڑنے والے فسادیوں سے سمجھے کہ میری محنت اور قربانی کے ثمرات یوں خاک میں مل کر رہے۔

۱۴۱ اب تقریر اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اس لیے خاتمۂ کلام پر نصیحت اور ملامت کے ملے جلے انداز میں لوگوں کو ان کی چند نمایاں ترین گمراہیوں پر متنبہ کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی پیغمبر کی دعوت کے مقابلہ میں انکار و استہزا کا جو رویہ انھوں نے اختیار کر رکھا تھا اس کی غلطی سمجھاتے ہوئے اس کے برے انجام سے انہیں خبردار کیا جا رہا ہے۔

۱۴۲ انسان اپنی زبان میں اشیاء کے جو نام رکھتا ہے وہ دراصل اس تصور پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں ان اشیاء کے متعلق ہوا کرتا ہے۔ تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اشیاء کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اس تصور پر ہی مبنی ہوا کرتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں ان کے متعلق رکھتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور تصور کی صحت و درستی تعلق کی صحت و درستی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ یہ حقیقت جس طرح دنیا کی تمام چیزوں کے معاملہ میں صحیح ہے، اسی طرح اللہ کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ اللہ کے لیے نام (خواہ وہ اسماء ذات ہوں یا اسماء صفات) تجویز کرنے میں انسان جو غلطی بھی کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر خدا کے متعلق اپنے تصور و اعتقاد میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے، اتنی ہی اور ویسی ہی غلطی اس سے اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رویہ کی تشکیل میں بھی سرزد ہوتی ہے کیونکہ انسان کے اخلاقی رویہ کی تشکیل تمام تر منحصر ہے اس تصور پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ خدا کے نام رکھنے میں غلطی کرنے سے بچو، خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اور اسے انہیں ناموں سے یاد کرنا چاہیے، اس کے نام تجویز کرنے میں الحاد کا انجام بہت برا ہے۔

"اچھے ناموں" سے مراد وہ نام ہیں جن سے خدا کی عظمت و برتری، اس کے تقدس اور پاکیزگی، اور اس کی صفات کمالیہ کا اظہار ہوتا ہو۔ "الحاد" کے معنی ہیں وسط سے ہٹ جانا (باقی)

حق ہی کے مطابق انصاف کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لیجائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی۔ میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، میری چال کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ ع

اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے[۱۴۴]، وہ تو ایک خبردار ہے جو (برا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔ کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا؟ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آ لگا ہو[۱۴۵]؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہ کے بعد اور کونسی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں۔ —— جس کو اللہ رہنمائی سے محروم کر دے اس کے لیے پھر کوئی رہنما نہیں ہے اور اللہ انہیں ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑے دیتا ہے۔

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو "اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے۔ اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔ آسمانوں اور زمین میں وہ بڑا سخت وقت ہوگا، وہ تم پر اچانک آ جائیگا۔" یہ لوگ اس کے متعلق تم سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا کہ تم اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہو۔ کہو "اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔" اے محمدؐ، ان سے کہو کہ "میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا[۱۴۶]۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانیوالا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔" ع

(بقیہ) سیدھے رخ سے منحرف ہو جانا۔ تیر جب ٹھیک نشانے پر بیٹھنے کے بجائے کسی دوسری طرف جا لگتا ہے تو عربی میں کہتے ہیں الحد السھم الھدف، یعنی تیر نے نشانے سے الحاد کیا۔ خدا کے نام رکھنے میں الحاد یہ ہے کہ خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں، جو اس کے ادب کے منافی ہوں، جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں، یا جن سے اس کی ذات اقدس و اعلیٰ کے متعلق کسی غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو۔ نیز یہ بھی الحاد ہی ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جائے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ اللہ کے نام رکھنے میں جو لوگ الحاد کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سیدھی طرح سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان کی کج بحثیوں میں تم کو الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنی اس گمراہی کا انجام یہ خود دیکھ لیں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۴۴ رفیق سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ آپ انہی لوگوں میں پیدا ہوئے، انہی کے درمیان رہے بسے، بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبوت سے پہلے ساری قوم آپ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم جنون ان باتوں پر نہ تھا جو آپ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے بلکہ صرف انہی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپ نے نبی ہو کر تبلیغ شروع کی۔ اسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے؟ آخر ان باتوں میں سے کونسی بات جنون کی ہے؟ کونسی بات بے تکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے، یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظر تامل دیکھتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگی رب کی دعوت اور انسان کی ذمہ داری و جوابدہی کے بارے میں جو کچھ ان کا بھائی انہیں سمجھا رہا ہے اس کی صداقت پر یہ پورا نظام کائنات اور خلق اللہ کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے۔

۱۴۵ یعنی نادان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے، کچھ خبر نہیں کہ کب کس کی اجل آن پوری ہو، پھر اگر ان میں سے کسی کا آخری وقت آ گیا اور اپنے رویہ کی اصلاح کے لیے جو مہلت اسے ملی ہوئی ہے وہ انہی گمراہیوں اور بداعمالیوں میں ضائع ہو گئی تو آخر اس کا حشر کیا ہوگا۔

۱۴۶ مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ٹھیک تاریخ وہی بتا سکتا ہے جسے غیب کا علم ہو، اور میرا حال یہ ہے کہ میں کل کے متعلق بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ یا میرے بال بچوں کے ساتھ کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اگر یہ علم مجھے حاصل ہوتا تو میں کتنے نقصانات سے قبل از وقت آگاہ ہو کر بچ جاتا اور کتنے فائدے محض پیشگی علم کی بدولت اپنی ذات کے لیے سمیٹ لیتا، پھر یہ تمہاری کتنی بڑی نادانی ہے کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ قیامت کب آئے گی۔

مقالات

سیرتِ محمدی کا پیغام بیسویں صدی کے نام

از مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی

(یہ مقالہ مولانا نے گذشتہ ماہ مارچ میں سیرت کمیٹی پشاور کے جلسۂ سیرت کیلئے لکھا گیا)

حضرات! جب ہمارے سامنے جاہلیت کا نام لیا جاتا ہے تو بے اختیار ہماری آنکھوں کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کا وہ تاریک زمانہ تصویر کی طرح پھر جاتا ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور جس میں آپ کی ہدایت اور تعلیم کا سب سے پہلا اور سب سے نمایاں معجزہ ظاہر ہوا۔ جاہلیت کا لفظ سنتے ہی دفعۃً عرب کی قوم اپنی ان تمام جاہلی خصوصیات و اخلاق کے ساتھ چلتی پھرتی نظر آتی ہے جن کا مرقع ہمارے سیرت نگاروں نے پیش کیا ہے۔

لیکن حضرات جاہلیت اسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ عہد زمانہ جاہلیت ہے، جو وحی و نبوت کی رہنمائی سے محروم ہو اور انبیاء علیہم السلام کی روشنی وہاں تک پہنچی ہی نہ ہو، یا پہنچی ہو لیکن اس نے اپنی آنکھیں اس کی طرف سے بند کر لی ہوں، خواہ وہ چھٹی صدی عیسوی کی عالمگیر جاہلیت ہو، یا یورپ کی تاریخ کی وہ تاریک متوسط صدیاں جو عموماً قرون مظلمہ (Dark Ages) کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، یا بیسویں صدی کا وہ روشن و تابناک عہد تہذیب و ترقی جس سے ہم گذر رہے ہیں۔

قرآن مجید ہم کو بتلاتا ہے کہ دنیا میں روشنی صرف ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے، اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، البتہ تاریکیاں بے شمار ہیں ان کا حد و حساب نہیں۔ اگر خدا کی روشنی کا (جو صرف انبیاء کے ذریعہ آتی ہے) اجالا ہو تو پھر دنیا کی ظلمتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں، زندگی کی ہر منزل اور اس کے ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے

كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (نور۔ ۵)

جیسے گہرے دریا میں اندھیرے، چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر، اس پر ایک اور لہر، اس کے اوپر بادل، اندھیرے ہیں ایک پر ایک، آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے خود نہ دیکھنے پائے، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کے واسطے کہیں روشنی نہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں نور اور ظلمت کا ساتھ تذکرہ آیا ہے نور کو صیغۂ واحد کے ساتھ اور ظلمت کو جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلمتیں متعدد ہو سکتی ہیں لیکن نور ایک ہی ہو گا۔ اس قدرتی روشنی کی اگر چمک نہ ہو تو پھر کسی مصنوعی روشنی سے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اجالا نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ روشن اور جیتی جاگتی دنیا ایک وسیع اور تاریک قبر ہے جس میں روشنی کا کوئی منفذ

نہیں، اور جہاں "شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا۔"

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ (انعام - ۱۵)

بھلا وہ جو مردہ تھا، ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو روشنی دی کہ اس کے سہارے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس کے برابر کہیں وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ اندھیروں میں پڑا ہوا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

حضرات! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی سرزمین تک (جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ ڈوبتا ہے) نبوت کی روشنی بہت کم پہنچ پائی۔ یہاں اس آسمانی روشنی کی خانہ پُری ہمیشہ انسانی روشنی سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ یونان اور روما کا عہد زریں انسانی علوم و فنون کی ترقی کے لحاظ سے بلاشبہ تاریخ کا درخشاں عہد ہے لیکن نبوت کی تعلیمات و ہدایت کے لحاظ سے اتنا ہی بے نور ہے جتنا تاریک سے تاریک دورِ جہالت ہو سکتا ہے۔ یہاں خدا کی ذات و صفات کے بارے میں بلا کسی رہنمائی اور روشنی کے محض قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (ان کو اس کا ذرا بھی علم نہیں۔ وہ محض اٹکل اور قیاس سے کام لیتے ہیں)۔ الٰہیات و فلسفہ کا وہ طلسم جو ان ملکوں کے حکما و فلاسفہ نے ترتیب دیا ہے اپنی خیال آرائی اور اعجوبہ زائی کے لحاظ سے مشرق کے طلسم ہوش رُبا اور فسانہ عجائب سے کم نہیں۔ سقراط و افلاطون (نہ کہ ارسطو) کے اقوال اور رواقی فلاسفہ کی اخلاقی تعلیمات میں انبیاء کی تعلیمات کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں ضرور اس طرح آ جاتی ہے جیسے برسات کی اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب کی چمک جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انبیا کی کچھ باتیں ان کے کان میں کبھی پڑی تھیں لیکن یہ روشنی اتنی تیز اور دیرپا نہیں کہ اس کے سہارے وہ اپنا سفر طے کر لیں۔ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا (جب بجلی چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں)۔

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت مسیح کا چراغ ہدایت مشرق میں تو دو صدی تک بادِ مخالف کے تحت جھونکوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن مغرب میں بت پرستوں کے دامن تلے بجھ کر رہ گیا۔ حضرت مسیح کی تعلیمات نے وہاں جا کر اپنی اصلیت کھو دی جہاں مسیحیت کو پہلی مرتبہ طاقت و حکومت حاصل ہوئی، شرک و بت پرستی کا دھارا مسیحیت کے بیچ دریا میں بہنے لگا۔ شاید ہی دنیا کے کسی مذہب کے لیے کوئی نو مذہب اتنا اَبا آگ ثابت ہوا ہو جتنا مسیحیت کے لیے شہنشاہ قسطنطین اور سینٹ پال۔ مسیحیت کے اس الہامی چراغ کے گل ہو جانے کے بعد اربابِ کلیسا نے مذہبی مجلسیں سجا کر اور ان میں کافوری شمعیں جلا جلا کر صدیوں خوش اعتقاد مسیحی دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح کی لائی ہوئی روشنی ان کے پاس موجود ہے، لیکن یہ روشنی درحقیقت صدیوں پہلے تاریکیوں میں گم ہو چکی تھی۔ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ (اس کی طرح جس نے آگ روشن کی جب آگ سے اس کا گرد و پیش روشن ہو گیا تو اللہ نے ان کی روشنی اٹھا لی اور ان کو تاریکیوں میں اس طرح چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا)۔

اس سب کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف واجب ہے کہ مسیحیت ہی کی بدولت مغرب میں خدا کا اعتقاد اور آخرت کا خیال پایا جاتا تھا حقیقت میں مسیحی مذہب کتنا ہی بدل جائے، خدا اور آخرت کا خیال اس کے رگ و ریشہ میں اس طرح ساری ہوتا ہے کہ کبھی اس سے نکل

نہیں سکتا۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں عقلیت گر در اصل مادہ پرستی اور مذہب پرستی کی جو تحریک پیدا ہوئی اس نے مغرب کو کھلے طریقہ پر مادہ پرستی کے راستہ پر لگا دیا۔ رفتہ رفتہ یورپ ایسا مادہ پرست ہو گیا کہ اس کی زندگی اور اس کے ذہنی نظام میں خدا اور آخرت کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ سارے یورپ نے اپنی زبان سے خدا اور آخرت کا انکار بالاعلان تو نہیں کیا لیکن اس کی زندگی اس طرح کی ڈھل گئی ہے کہ گویا نہ خدا ہے، نہ آخرت۔ آج یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یورپ کا مذہب مسیحیت نہیں بلکہ مادیت ہے۔ یورپ عرصہ دراز تک بت پرست رہا ہے اور عرصہ دراز سے مسیحیت کا مدعی ہے لیکن اس اخلاص اور جوش کے ساتھ اس نے نہ کبھی بت پرستی کی اور نہ مسیحیت کی پیروی کی جیسی کہ آج مادیت کے اس مذہب کی کر رہا ہے۔ اس نئے مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں (کارخانے، صنعتی و تجارتی مراکز اور تفریح گاہیں) شب و روز معمور ہیں۔ اس مذہب کے پروہت (ملک التجار، سرمایہ دار، صناع) بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل عیسائیت مغرب میں سایہ بن کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کے رجحان کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہوگا، پروفیسر جوڈ اپنی تالیف (A Guide to modern Wickedness) میں لکھتا ہے

"میں نے بیس طلبہ اور طالبات کی، جو سب کے سب بیس سے کچھ اوپر عمر کے تھے، ایک جماعت سے سوال کیا کہ ان میں سے کتنے کسی معنی میں بھی عیسائی ہیں۔ صرف تین نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا، عیسائی ہونے کا اقرار کیا۔ سات نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا۔ باقی دس نے صاف صاف کہا کہ وہ کھلے طور پر مسیحیت کے خلاف ہیں۔

میرا خیال ہے کہ مسیحیت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا یہ تناسب اس ملک میں کوئی استثنائی اور غیر معمولی مثال نہیں" (ص ۱)

اس مادہ پرستی کا ایک شعبہ اور مظہر زر پرستی ہے جو مغرب میں عروج پر ہے۔ یہی مصنف اپنی دوسری تصنیف (Philosophy for our times) میں لکھتا ہے

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ ہے جو ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور جانچتا ہے"۔

مغرب میں اس خدا فراموشی کے وہ سب نتائج ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں، جو اس ذہنیت و سیرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ایک نتیجہ یہ ہے کہ مغربی انسان نے ایک خدا کا دامن چھوڑ کر دوسرے سینکڑوں خداؤں کا دامن پکڑ لیا ہے، ایک حقیقی آستانہ سے سر اٹھا کر، جہاں سر جھکانے کے بعد وہ تمام آستانوں سے بے نیاز ہو سکتا تھا، ہر سنگ آستاں پر وہ اپنی پیشانی رگڑ رہا ہے۔ ایک خدا کو چھوڑ دینے کی سزا خدا کی طرف سے ہمیشہ یہی ملی ہے۔ یہ ارباب من دون اللہ بڑی تعداد میں مغرب پر مسلط ہیں اور ساری مغربی دنیا ان کے پنجہ غضب میں گرفتار ہے۔ یہ کہیں سیاسی سردار ہیں، کہیں اقتصادی دیوتا، کہیں اپنے تراشے ہوئے معیار زندگی، کہیں خود تجویز کیے ہوئے فرائض و لوازم زندگی جنھوں نے اپنے پرستاروں کی زندگی تلخ کر رکھی ہے اور آج اپنی ایسی بندگی کرا رہے ہیں جس کے سامنے خدا کی بندگی کی ہزار بار قدر آنی چاہیے، ایسی مشقت لے رہے ہیں جو بے زبان جانوروں اور بے جان مشینوں سے نہیں لی جاتی، ایسی قربانیاں کرا رہے ہیں جو آج تک کسی دیوتا کے نام پر نہیں کی گئیں۔ ان ارباب متفرقون کے مقاصد و خواہشات میں سخت تصادم و

کشمکش ہے۔ ان کے ان متضاد مقاصد کی خاطر سارا عالم زیروزبر ہو رہا ہے۔ ان بتان نو میں خاک وطن کا بھی ایک بڑا بت ہے جو ہمیشہ خون کی نذر اور انسانی جانوں کی بھینٹ چاہتا رہتا ہے۔ انھیں میں ایک بت پیٹ ہے جس کی بندگی میں بیسویں صدی کا انسان رات دن لگا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سے راضی نہیں۔ کچھ مدت ہوئی سر آیوولاج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا

"زندگی کی سادگی اب خواب وخیال ہوگئی۔ اب نہ کوئی مقصد سامنے ہے نہ اونچا تخیل، ہر شخص رات دن بیل کی طرح اپنے کارخانے یا دفتر کی غلامی میں لگا ہوا ہے، تیز رفتار سواریوں کی ایجاد کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وقت ہر شخص کے پیر پر گویا سنیچر سوار رہتا ہے"!

خدا فراموشی کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود فراموش ہوگیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ (ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو خدا کو بھول گئے تو خدا نے انھیں خود اپنے آپ سے بے خبر کردیا)۔ بیسویں صدی کا انسان خود فراموشی کا مکمل نمونہ ہے۔ اس نے اپنی حقیقت، اپنا انسانی امتیاز، اپنا مقصد زندگی اور اپنی پیدائش کی غرض بالکل بھلا دی، اور بالکل بہیمانہ یا جماداتی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے۔ وہ ایک ایسی روپیہ ڈھالنے والی مشین بن گیا ہے جو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ حد یہ ہے کہ جسمانی راحت اور قلبی سکون واطمینان جو اس جدوجہد کی کسی معنی میں قیمت ہو سکتا ہے، نہ اس کو اپنی زندگی میں میسر ہے، اور نہ اس کو اس کا ہوش باقی رہا ہے۔ سابق الذکر مصنف (پروفیسر جوڈ) نے صحیح لکھا ہے

"جہاں تک ہمارے زمانے کی سوسائٹی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے سرعت کا، سرعت زمانۂ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانے پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے"۔[1]

اس عالم خود فراموشی اور مدہوشی میں انسان کا موضوع ہی بدل گیا ہے۔ اس نے انسانی دائرۂ ترقی کو چھوڑ کر ترقی کے غیر انسانی دائروں میں بڑی ترقی کر لی ہے لیکن کامل انسان کی حیثیت سے اس نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ روز بروز اس کے انسانی خواص میں تنزل ہو رہا ہے۔ موجودہ ترقیات کا تجزیہ کیجیے، کچھ درندوں کے کمالات نکلیں گے، کچھ پرندوں کے اور کچھ مچھلیوں کے۔ ایک مغربی مصنف نے اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے۔ ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں، سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں، ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (Big Ben) کی آواز سنا کرتے ہیں، بچے ٹیلیفون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، برقی تصویریں آنے لگیں، بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے، بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں، کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں، ربر کی سڑکیں بنتی ہیں، ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندر جھانک کر

---

[1] A Guid to Modern Wickedness. P. 241

دیکھ سکتے ہیں، تصویریں بولتی اور گاتی ہیں، لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے، برقی موجوں سے بالوں میں پیچ وخم پیدا کیا جاتا ہے، آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک ہو کر جاتے ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام اور حفاظت سے ساتھ کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور نوے ہزار زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (Pendin Sands) پر تین سو یا چار سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے رکارڈ قائم کیا تھا اور کسی ہواباز نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت، مجھے یاد نہیں، بیس گھنٹے میں یا پچاس گھنٹے میں طے کی تھی۔ جب میں کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اُڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آتا[۵]۔"

اس عالم خود فراموشی میں مغرب کی خدا فراموشی کا شکوہ ہی فضول ہے۔ وہ تو اقبال کے اس شعر کا صحیح مخاطب ہے۔

زخود گریختی، آشنا چہ می جوئی ۔۔۔ بآدمی نہ رسیدی، خدا چہ می جوئی

اب مغرب کی آخرت فراموشی کو لیجیے۔ انکار آخرت کا پہلا اور طبعی اثر یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور دنیا کی چیزوں سے لذت و تمتع کا ایک جنون اور بحران پیدا ہو گیا ہے۔ تمتع ہی مقصد حیات قرار پا گیا ہے۔ آج مغرب کے ہر گوشہ سے صدائے نائے و نوش اور نعرۂ "بعیش کوش" بلند ہو رہا ہے اور اس کی ساری زندگی اس کے اور اس کے ذرائع کے حصول کی مسابقت میں صرف ہو رہی ہے۔ اس مسابقت نے زندگی کو ایک ایسا ریس کا میدان بنا دیا ہے جس کا کوئی منتہا نہیں۔ زندگی کی ایک نہ بجھنے والی پیاس اور ایک نہ مٹنے والی بھوک ہے۔ ہر شخص کی زبان پر ھل من مزید کی صدا ہے۔ زندگی کی ضروریات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ نفس کے مطالبات کی تکمیل کا سامان اور اس میں تنوع قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے اور اس نے صدہا اجتماعی و معاشی پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ تاجرانہ رقابت اور مقابلہ نے اس میں اور امداد دی۔ معیار زندگی روز بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ہر شخص جب نظر اٹھاتا ہے منزل اس کو دور اور بام مقصود اونچا نظر آتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اس کے حصول کی تمنا اور کوشش میں بے کیف اور بے لطف ہو جاتی ہے اور وہ حرص و طمع کے ایک مسلسل عذاب اور زندگی کی لامتناہی جدوجہد میں مبتلا رہتا ہے۔ صبر و قناعت جو سکون و اطمینان قلب کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یورپ میں عرصے سے ناپید ہے۔

حضرات! آپ تعجب نہ کریں، انکار آخرت یا آخرت کو فراموش کر دینے کے بعد لذت و تمتع کا یہ جذبہ جس کو ہم مسلمان دیوانگی سمجھتے ہیں منکر آخرت کے نقطۂ نظر سے عین فرزانگی ہے۔ جو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے تصور سے خالی ہو وہ اس زندگی میں لطف اٹھانے اور جگر کی آگ بجھانے میں کیوں کمی کرے، اور عیش و لطف کو کس دن کے لیے اٹھا رکھے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ ۔۔۔ کافر لطف اندوز ہوتے ہیں اور کھاتے ہیں اس طرح جیسے جانور

۵۔ A Guid to Modern Wickedness. P. 261, 262-263.

الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (محمد - ۱)

کھاتے ہیں اور جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔

دوسری جگہ کہتا ہے:-

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (حجر - ۱)

انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو، کھائیں، پئیں، عیش و آرام کریں اور امید دل پر بھولے رہیں، وہ وقت دور نہیں کہ انھیں معلوم ہو جائے گا۔

انکار آخرت کا دوسرا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی چیزیں اور اس میں کام آنے والے اعمال زیادہ آراستہ، زیادہ معقول اور زیادہ مدلل نظر آتے ہیں۔ مادی ذہنیت اور سطحی نگاہ پیدا ہو جاتی ہے جو حقائق تک نہیں پہنچ سکتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ (نمل - ۱)

بے شک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے ہیں، چنانچہ وہ بھٹک رہے ہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا. اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (الکہف - ۱۲)

کہو ہم تمھیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں دنیا کی زندگی میں کھو گئیں اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا کام بنا رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور اس کے حضور حاضر ہونے سے منکر ہوئے پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لیے قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن تسلیم نہ کریں گے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ زندگی میں حقیقت و سنجیدگی کا حصہ کم اور لہو و لعب کا زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی کے ایک بڑے حصہ کو تفریحات اور سرور و نشاط کے اعمال و مشاغل گھیرے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے نازک وقتوں اور خطرات میں بھی ان کے اس تفریحی انہماک اور لطف اندوزی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (الانعام - ۸)

چھوڑ دو ان کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا رکھا ہے اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ حوادث و واقعات کے حقیقی اسباب و علل پر ان کی نظر نہیں جانے پاتی بلکہ چند ظاہری چیزوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ معاملات کی گہرائی تک نہیں اتر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہایت نازک وقت میں بھی ان کے تفریحی انہماک اور غفلت میں کمی نہیں ہوتی، واقعات کی کوئی تاویل کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی فرضی اور غیر حقیقی وجہ تلاش کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں، اور ان کے رویہ میں کوئی انقلابی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں مادہ پرست و ظاہر بین قوموں کی نفسی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی امتوں پر رسول بھیجے تھے۔ پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کیا تاکہ وہ ہمارے حضور گڑگڑائیں۔ تو کیوں نہ وہ گڑگڑائے جبکہ ہماری طرف سے ان پر سختی آئی؟ مگر ان کے دل

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الانعام - ۵) تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے کام ان کو آراستہ کر کے دکھائے۔

انکار آخرت کی ایک خاصیت تکبر ہے۔ منکر آخرت کو متکبر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ جو اپنے سے کسی بالاتر طاقت اور اس زندگی کے بعد کسی زندگی اور روز جزا کا یقین نہیں رکھتا، اس کو ایک شتر بے مہار اور ایک سرکش انسان بننے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ اس لیے قرآن مجید میں انکار آخرت کے ساتھ بکثرت تکبر کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں

وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ — اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر اور وہ متکبر ہیں۔

فرعون اور اس کے لشکر کے متعلق کہا گیا:۔

فَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ۔ — فرعون اور اس کے لشکروں نے حق کے مقابلہ میں تکبر و انکار سے کام لیا اور وہ سمجھے کہ وہ ہماری طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

ایسی منکر آخرت اور مادہ پرست قوموں کا پنجہ آہنی، ان کی گرفت ظالمانہ، اور ان کی فتح ایک آفت ہوتی ہے جو ملکوں اور شہروں کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (الشعراء - ۷) — جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو زبردستوں اور ظالموں کی طرح ہاتھ ڈالتے ہو

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً — بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔

اسی طرح مغرب ایمان بالرسالۃ کی دولت سے بھی محروم رہا۔ حضرت مسیح کو اس نے ابن اللہ تک مان لیا مگر عملاً ان کو اپنی پوری زندگی کا رہنما اور امام مطاع تسلیم نہیں کیا۔ پہلی چیز صرف ایک نظری اور اعتقادی تھی، اس کے تسلیم کرنے سے زندگی اور اخلاق و اعمال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بخلاف اس کے ان کو اپنی زندگی کا رہنما نے کامل، ان کی سیرت کو مشعل زندگی اور ان کو اپنے لیے اسوۂ کامل ماننے سے زندگی کا رُخ بدل جاتا۔ لیکن مغرب نے ایسا نہیں کیا اور نہ ایسا کرنا آسانی سے ممکن تھا۔ حضرت مسیح کی زندگی کے صرف تین سال کے حالات اس کے پاس تھے اور وہ بھی ایسے کہ زندگی میں ان کی تقلید و اقتدا بہت مشکل تھی۔ اگر اہل مغرب حضرت مسیح کی سیرت و اقوال اور ان کی ہدایت و تعلیمات کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا چاہتے تو ان کے لیے اس میں عملی دقتیں تھیں، مذہب مسیحی کے نمائندوں کے پاس ایسا کوئی مستند مذہبی سرمایہ نہ تھا جس کی مدد سے وہ ایک پوری قوم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے، نہ وہ ایسی دینی حکمت و بصیرت رکھتے تھے جس سے وہ مغرب کی نوخیز قوموں کو دنیاوی ترقی کے ساتھ مذہب کے دائرے میں رکھ سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی قوموں نے اپنی عملی زندگی حضرت مسیح کی قیادت اور کلیسا کی نگرانی سے آزاد کر لی اور انھوں نے اس طرح کی زندگی گذارنی شروع کر دی گویا کہ وہ کسی پیغمبر کی امت نہیں ہیں۔ ان کے دماغوں اور دلوں پر حضرت مسیح کی معصومانہ تعلیمات کا گہرا اثر نہیں پڑ سکا۔ وہ اس اخلاقی تربیت اور تزکیہ سے محروم رہے جو پیغمبروں کے پیرو حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے وسائل بکثرت حاصل کیے لیکن خیر کا رجحان صرف پیغمبر کی تعلیمات کے اثر اور اس کی تربیت و اصلاح سے حاصل ہو سکتا ہے، مادی علوم و اکتشافات سے وہ نہ حاصل ہو سکتا تھا نہ ان کو حاصل ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سارے وسائل اور یہ تمام طاقتیں جو خیر کے رجحان کے ساتھ عالم انسانی کی

بہبودی کا سبب بن سکتی تھیں، زمین میں سربلندی اور فساد کا آلہ بن گئیں، اس لیے کہ ان کے استعمال کرنے والوں کے کان اِس صدا سے ناآشنا ہیں:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ○

وہ پچھلا گھر تو ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور فساد نہیں چاہتے اور انجام کار کی بھلائی تو اللہ سے ڈرنے والوں کا حصہ ہے۔ (قصص - ۹)

حضرات! اس خدا فراموشی، آخرت فراموشی، اور پیغمبروں کی تعلیمات سے استغنا و بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب آج اِس قدر روشن ہے کہ اس کی رات بھی دن ہے لیکن اس قدر تاریک ہے کہ دن بھی رات ہے۔ روشنی اور ترقی کے اس دور میں آج وہ سب کچھ پیش آرہا ہے جو وحشت و بربریت کے دور کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ بقول میر اکبر حسین الہ آبادی مرحوم:

لکھے گا کلکِ حسرت یہ دنیا کی ہسٹری میں اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

گزشتہ جنگ کے اختتام پر مسٹر لائڈ جارج نے کہا تھا:

"اگر حضرت مسیح اس دنیا میں تشریف لے آئیں، تو زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ وہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ دو ہزار برس کے بعد بھی انسان فتنہ و فساد و کشت و خون، قتل و غارت میں بدستور مبتلا ہے، بلکہ اس وقت تو انسانیت کے جسم سے تاریخ کی عظیم ترین جنگ کے اثر سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں، اور زمین اس قدر تاراج ہو چکی ہے کہ نوبت فاقہ کشی کی آگئی ہے۔ اور حضرت آکر کیا دیکھیں گے؟ کیا اخوت و مساوات کے ساتھ لوگوں کو ہاتھ ملاتے؟ یا اس کے بالکل برعکس اس جنگ عظیم سے بھی بڑھ کر مہلک و خوفناک جنگ کی تیاریاں کرتے؟ ایک سے بڑھ کر ایک جان لیوا اور ستم کش آلاتِ ہلاکت ایجاد کرتے اور تعذیب کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے؟"[1]

اور موجودہ جنگ کے آغاز پر مسٹر ایڈن نے فرمایا:

"........ اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصہ میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرزِ زندگی اختیار کرلیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لیے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہیں تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے۔ میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اُڑ کر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا۔ وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقِ استعمال کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔"[2]

حضرات! آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی متمدن دنیا جس کی رہنمائی روم و ایران کی مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے ہاتھ میں تھی، آج کی دنیا سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ انسان پورے طور پر خدا فراموش ہو گیا تھا۔ خدا کا اعتقاد ایک تاریخی نظریہ اور علم کر

[1] منقول از "of A Guide to Modern Wickedness"

زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لوگ صرف تاریخی طور پر یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس عالم کو کسی زمانہ میں خدا نے پیدا کیا تھا، وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ۔ لیکن عملی زندگی کا کوئی ربط اس سے باقی نہیں رہا تھا، اور زندگی عملاً اس طرح گذر رہی تھی کہ گویا خدا نہیں ہے، یا ہے تو (معاذ اللہ) گوشہ نشین اور دوسروں کی خاطر سلطنت سے دست بردار ہو چکا ہے۔ ساری زمین پر اَرْبَابٌ مِّن دُونِ اللّٰہ کی عبادت و پرستش کا جال پھیلا ہوا تھا۔ کہیں بتوں کی پرستش تھی، کہیں قوم و نسل کی، کہیں ہوا و ہوس کی، کہیں طاقت و اقتدار کی، کہیں ملوک و سلاطین کی اور کہیں احبار و رہبان (عالموں اور عابدوں) کی۔ انسان اپنی زندگی کا مقصد اور زندگی کے صحیح مشاغل بھول کر تدریجی خودکشی اور غلط مشاغل میں منہمک تھا۔ ساری دنیا پر ایک عالم خود فراموشی طاری تھا۔ اہل حکومت ظلم و جور، جبر و استبداد، مردم آزاری، اور دولت ستانی میں مشغول تھے۔ امرا اپنے عیش و عشرت میں بدمست ہو رہے تھے۔ زندگی کا معیار اتنا بلند اور لوازم زندگی اتنے کثیر ہو گئے تھے کہ نئے نئے محاصل اور تاوانوں اور مظالم سے بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ معاشرت کا معیار اور زندگی کا تخیل اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ جس شخص کے پاس امارت کے لوازم نہ ہوتے اس کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں اس کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ زندگی کی گرانی اور ہم چشموں میں با اعتبار اور باوقار رہنے کی فکر میں ہر شخص ہمیشہ ایک فکر و غم اور کوفت میں مبتلا رہتا۔ متوسط طبقہ کے لوگوں کو اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی نقالی اور ریس سے فرصت نہ ملتی۔ غربا کو محکومی اور غلامی اور نئے نئے محاصل کے بوجھ سے سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ وہ اپنے آقاؤں کے عیش و آرام اور ان کے جائز و ناجائز مطالبات کی تکمیل کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہتے اور جب کبھی اس سے چھٹی ملتی تو زندگی کا غم غلط کرنے کے لیے ناچ گانے، تفریحات اور بدمستیوں سے دل بہلاتے۔ پورے پورے ملک میں بعض اوقات ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جس کو اپنے دین اور آخرت کی فکر ہوتی اور موت کا خیال آتا۔ بے گناہ شہری، حکومتوں کے حرص و آز اور ملک گیری کی ہوس کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پستے رہتے۔ ایرانی سلطنت نے بغیر کسی معقول وجہ اور ضرورت کے شام کی عیسائی سلطنت پر فوج کشی کی اور لاکھوں بےگناہ انسانوں کے خون سے اللہ کی زمین رنگین کی۔ اس کے جواب میں رومی سلطنت نے ایرانی سلطنت کو زیر و زبر کر دیا اور پُرامن شہریوں کا انتقام پُرامن شہریوں سے لیا۔ بلا کسی بلند مقصد اور اخلاقی مہم کے اس خونیں جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا اور دنیا کی دو متمدن سلطنتوں کے باشندے اور مہذب و متمدن ترین انسان وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے۔ پورے کرۂ ارض پر اس وقت اندھیرا چھایا ہوا تھا اور انسانوں کی غلط کاریوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ایک عالمگیر ابتری اور ہمہ گیر خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

(الروم - ۱)

اس وقت اس متمدن دنیا سے (جس کو پورے طور پر گھن لگ چکا تھا) الگ لیکن اس سے بالکل قریب اور ان دونوں حریف مشرقی و مغربی شہنشاہیوں کے بیچ میں اللہ تعالیٰ نے امیوں کے درمیان ایک اُمّی پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ دنیا کو اس عذاب سے نجات دے جس میں وہ صدیوں سے مبتلا تھی اور آخرت کے اس عذاب سے ڈرائے جو پیش آنے والا ہے، تاریکیوں سے نکال کر خدا کی روشنی میں لائے، بندوں کی بندگی سے نکال خدا کی بندگی میں داخل کرے اور وہ تمام زنجیریں اور بیڑیاں کاٹے جن میں وہ جکڑے ہوئے ہیں۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ (وہ نبی امی) انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، پسندیدہ

لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

چیزیں حلال کرتا ہے، گندی چیزیں حرام ٹھہراتا ہے، اس بوجھ سے نجات دلاتا ہے جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں، ان پھندوں سے نکالتا ہے جن میں وہ گرفتار ہیں۔

اسی نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ (۶۳۰ء) میں رومی شہنشاہ (ہرقل) کو مدینہ سے ایک خط اور پیغام بھیجا جس میں دعوت تھی:

يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۔ ۷)

اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔

ہرقل نے اس دعوت کی صداقت کو تسلیم کر لیا لیکن وہ اپنی کمزوری کی بنا پر اس ربوبیت سے دست بردار نہ ہو سکا جس سے وہ متمتع ہو رہا تھا۔ اس طرح رومی زندگی کے اس عذاب سے اس وقت تک نجات حاصل نہ کر سکے جب تک کہ مسلمان مجاہدین نے شام و روم کے ممالک کو اپنے سایۂ رحمت میں نہیں لے لیا۔

لیکن عرب کی درماندہ قوم نے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول کر لیا اور وہ ساری نعمتیں حاصل کیں جو اس پیغام کا نتیجہ ہیں۔ ان کی غلامی کی تمام زنجیریں خود بخود کٹ گئیں، خدا کے آستانہ پر سر جھکا کر وہ دنیا کے تمام آستانوں سے بے نیاز ہو گئے، نہ نفس کی بندگی رہی، نہ بادشاہوں اور حکومتوں کی غلامی، نہ جاہلانہ رسم و رواج اور معاشرت و سوسائٹی کی سابق ظالمانہ بندشیں، نہ اپنی لائی ہوئی اور نہ دوسروں کی ڈالی ہوئی مصیبتیں۔ خدا شناسی اور خدائی عظمت و کبریائی کے علم نے دنیائے مصنوعی خداؤں کی عظمت کا طلسم توڑ دیا اور ان کو ان کی نظر کو گرا دیا۔ عرب کے یہ فاقہ مست، دریدہ پیرہن، گلہ بان اعرابی جو کبھی اپنے صحرا اور بادیہ سے باہر نہ نکلے تھے اور جنھوں نے شان و شوکت کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا تھا، شاہان عجم سے اس طرح آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان کے درباری کر و فر کو اس بے پروائی اور تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے گویا مٹی کی مورتیں اور کاغذ کے کھلونے ہیں جن کو جھنڈیوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ وہ ایسے حقیقت شناس ہو گئے تھے کہ شان و شوکت کے کھوکھلے مظاہر ان کو ذرا متاثر نہ کرتے اور کہیں وہ اپنے اصول اور اعلیٰ اخلاقی معیار سے ذرا بھی انحراف کرنا پسند نہ کرتے۔ وہ اپنے کو خدا کے بندوں کو دوبارہ خدا کی بندگی میں داخل کرنے اور انسانوں کی خدائی کا طلسم توڑنے پر مامور و مبعوث سمجھتے۔

حضرت سعد بن وقاص نے ایرانیوں کے سپہ سالار اعظم اور امیر رستم کی فرمائش پر ربعی بن عامر کو بطور سفیر کے بھیجا۔ ایرانیوں نے بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ دربار سجایا۔ زریں قالین، اور ریشمیں فرش بچھائے۔ یاقوت اور آبدار موتیوں کی چمک سے نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ رستم سر پر تاج زریں رکھے اور جسم پر زرنگار پوشاک پہنے سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ ربعی اس شان سے دربار میں داخل ہوئے کہ جسم پر موٹے موٹے کپڑے، ہاتھ میں تلوار و سپر، اور رانوں کے نیچے کوتاہ قامت گھوڑا۔ وہ اسی شان بے نیازی کے ساتھ گھوڑے پر سوار فرش پر آ گئے، گھوڑے سے اتر کر امراء دربار کے ایک گاؤ تکیہ سے گھوڑے کو باندھ دیا۔ زرہ پوش، ہتھیار بند مجلس میں آئے۔ چوبداروں نے عرض کیا ہتھیار رکھ دیجیے، کہا میں اپنے شوق سے نہیں آیا تمھارا بلایا ہوا آیا ہوں، اگر تمھیں اس طرح میرا آنا منظور نہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ رستم نے کہا آنے دو۔ ربعی قالینوں پر اپنے نیزے کو چھوتے ہوئے اور اس سے عصا کا کام لیتے ہوئے اس طرح بے تکلف

بڑھتے چلے گئے کہ قالین جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گئے۔ جاکر رستم کے پاس بیٹھے۔ رستم نے پوچھا کہ آپ کا اس ملک میں آ۔۔نے کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے کہا اللہ نے ہمکو اس کام کے لیے مقرر کیا ہے کہ ہم اس کے حکم سے اس کے بندوں کو بندوں کی بندگی کر نکال کر اللہ کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت وکشادگی میں، مذاہب کے ظلم وجور سے بچا کر اسلام کے عدل وانصاف میں داخل کریں۔ اس نے ہم کو اپنی مخلوق کی طرف اپنے دین کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ ہم اس کو اس دین کی دعوت دیں۔ اگر وہ اس کو مان لے تو ہم بھی مان لیں اور واپس چلے جائیں۔ اور جس کو اس سے انکار ہو اس سے ہم ہمیشہ لڑتے رہیں یہاں تک کہ ہم کو اللہ کا انعام مل جائے۔ رستم نے کہا وہ انعام کیا ہے؟ کہا، جو اس راستہ میں مرجائے اس کے لیے جنت اور جو زندہ رہ جائے اس کے لیے اللہ کی نصرت۔ رستم نے کہا میں نے آپ کی بات سن لی، کیا آپ ہم کو اتنی مہلت دے سکتے ہیں کہ ہم ا۔ کان سلطنت سے مشورہ کرلیں۔ کہا، ہاں، آپ کو کتنی مہلت چاہیے؟ ایک دن یا دو دن؟ کہا، اتنے تھوڑے وقت میں کیا ہوگا؟ ہمیں خط وکتابت کرنی پڑے گی اور رائے معلوم کرنی ہوگی۔ ربعی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے مقابلہ کے وقت تین دن سے زیادہ مہلت دینے کی نظیر نہیں چھوڑی۔ لہٰذا اس معاملہ پر جلد غور کرلیجیے، اور تین چیزوں (اسلام، جزیہ اور جنگ) میں سے کسی ایک چیز کو انتخاب کرلیجیے۔ رستم نے کہا، آپ مسلمانوں کے سردار ہیں؟ ربعی نے کہا، نہیں، مسلمان سب جسم واحد ہیں، ان میں سے سب سے ادنیٰ کو بھی سب کے اعلیٰ کے مقابلہ میں پناہ دینے کا حق ہے۔

ایک سفارت میں حضرت مغیرہ گئے۔ اس دن دربار کی نئی شان تھی۔ ایرانیوں نے اپنی شان وشوکت اور دولت وحشمت کا انتہائی مظاہرہ کیا تھا۔ مغیرہ بے تکلف صدر کی طرف بڑھتے ہوئے صدر مجلس (رستم) کے زانو سے زانو ملاکر بیٹھ گئے۔ ایرانیوں نے یہ منظر کہاں دیکھا تھا، تاب نہ لاسکے اور بازو پکڑ کر تخت سے اتار دیا۔ مغیرہ نے کہا، مہمان کے ساتھ تو یہ سلوک مناسب تھا۔ ہم لوگوں میں یہ دستور نہیں کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور تمام لوگ اس کے آگے بندوں کی طرح کھڑے ہوں۔ ان کی اس بے باکانہ گفتگو کا ترجمہ کیا گیا تو دربار پرستناٹا چھا گیا اور لوگوں نے اعتراف کیا کہ ہماری غلطی تھی۔

ایک رومی دربار میں حضرت معاذ بن جبل سفیر بن کر گئے۔ دربار میں دیبائے زریں کا فرش بچھا تھا۔ معاذ زمین پر بیٹھ گئے اور کہا میں اس فرش پر جو غریبوں کا حق چھین کر بنایا گیا ہے، بیٹھنا نہیں چاہتا۔ عیسائیوں نے کہا ہم تو تمھاری عزت کرنا چاہتے تھے لیکن ہم کیا کریں، تم کو خود اپنی عزت کا خیال نہیں۔ معاذ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوگئے اور کہا جس کو تم عزت سمجھتے ہو مجھے اس کی پروا نہیں، اگر زمین پر بیٹھنا غلاموں کا شیوہ ہے تو مجھ سے بڑھ کر کون خدا کا غلام ہوسکتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ مسلمانوں میں تم سے بھی کوئی بڑھ کر ہے؟ معاذ نے کہا معاذ اللہ یہی بہت ہے کہ میں سب سے بدتر نہ ہوں۔ رومیوں نے اپنے بادشاہ پر فخر کیا۔ معاذ نے کہا کہ تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمھاری جان ومال کا اختیار ہے، لیکن ہم نے جس کو بادشاہ بنا رکھا ہے وہ اپنے آپ کو کسی بات میں ترجیح نہیں دے سکتا، اگر وہ زنا کرے تو اس کو درے لگائے جائیں، چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں، وہ پردہ میں نہیں بیٹھتا، اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا، مال ودولت میں اس کو ہم پر کوئی ترجیح نہیں۔

اس ذہنی وقلبی انقلاب سے جو ایک خدا کو اپنا معبودِ حقیقی اور رب مان لینے سے پیش آیا، ان کی زندگی سراسر تبدیل ہوگئی۔ جو بہائم صفت تھے وہ فرشتہ خصلت انسان بن گئے۔ جو غارت گر اور رہزن تھے وہ دوسروں کی جان ومال اور عزت وناموس کے محافظ بن گئے۔ جو جانوروں کے پہلے اور پیچھے پانی پینے پلانے پر خون کی ندیاں بہا دیتے تھے، دوسروں کی خاطر پیاسا مرجانا پسند کرنے لگے۔ جو اپنی

بچیوں کو اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے وہ دوسروں کی بچیوں کی پرورش کے لیے اپنی گودیں خالی کرنے لگے۔ جو دوسروں کے مال کو اپنا مال سمجھتے تھے وہ اپنا مال بھی دوسروں کا مال سمجھنے لگے۔ جن کو دن کی روشنی میں لوگوں کا مال لوٹ لینے میں باک نہ تھا وہ ایسے امانت دار بنے کہ ان کا ایک شخص رات کی تاریکی میں خسارہ ایران کا تاج زریں جو لاکھوں روپے کی مالیت کا تھا اپنے کمل میں چھپا کر امیر لشکر کے پاس پہنچاتا ہے۔

خدا طلبی نے دنیا طلبی اور زر طلبی کے اس بحران اور جوش کو سرد کر دیا جس نے دنیا کی عافیت تنگ کر دی تھی اور دنیا کو محض ایک بازار اور منڈی بنا دیا تھا۔ مسابقت کا وہ فطری جذبہ جو انسان کی دبی ہوئی قوتوں کو ابھارتا اور اس کے جوہروں کو چمکاتا ہے، جب تک دنیا کی طرف متوجہ رہا اس نے زندگی کو ایک غیر مختتم کشمکش بنا دیا تھا اور بھائی بھائی میں رقابت پیدا کر رکھی تھی۔ مگر جب اسی جذبہ کا رخ دین کی طرف پھیر دیا گیا تو اس نے شریفانہ انسانی خصائل کو ابھار دیا اور سیرت کو پاکیزہ بنا دیا۔ مختلف انسانی طبقات اور ان طبقوں کے مختلف افراد میں اب بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش تھی مگر نیک کرداری، اجر و ثواب و رضا کی مغفرت و رضا کے حصول میں۔ ایک دفعہ غربا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ ہمارے دولت مند بھائی ہم سے آگے بڑھے جا رہے ہیں، نماز روزہ وہ ہماری طرح کرتے ہیں اور صدقہ اور خیرات میں ہم ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ آپ نے ان کو ایک ذکر بتا دیا۔ دولت مندوں نے سنا تو انھوں نے بھی وہ ذکر شروع کر دیا۔ غربا نے آکر پھر عرض کیا کہ ہم تو پھر پیچھے رہ گئے، ہمارے دولتمند بھائیوں نے بھی وہی ذکر شروع کر دیا ہے جو آپ نے ہم کو بتلایا تھا۔ آپ نے ان کو تسکین دی۔

زہد و قناعت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیا جس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی جھلک نظر آتی تھی۔ مال کی طمع اور حرص و منافست کے دور ہو جانے سے قلوب میں ایسی الفت اور محبت پیدا ہو گئی تھی کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (ہم نے ان کے سینے کے کھوٹ کو نکال دیا)، کا منظر جو اہل جنت کی صفت ہے دنیا میں نظر آنے لگا۔ حقوق طلبی کے بجائے فرض شناسی اور طمع کے بجائے ایثار کا ایسا مادہ پیدا ہو گیا کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ کا نظارہ دیکھنے والوں کو نظر آیا، اور چشم فلک نے حیرت کے ساتھ یہ سماں دیکھا کہ میزبان نے اپنے بچوں کو بھوکا سلا کر اور چراغ بجھا کر مہمانوں کو یقین دلایا کہ ان کے ساتھ وہ کھانے میں شریک ہے۔ مہمان شکم سیر ہو کر اٹھے اور میزبان بیوی بچوں سمیت رات بھر بھوکا رہا۔

یہ ساری اصلاح اور یہ ساری ترقی نتیجہ تھی اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لینے، اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے اور خود کو ایک معصوم پیغمبر کی نگرانی اور تربیت میں دیدینے کا۔ اس سے گویا ان کی زندگی کی چول ٹھیک بیٹھ گئی اور ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھیک آگئی۔

حضرات! یہی دنیا نے اس پیغام کی قدر کی۔ اس کا شرقی حصہ تو بہت جلد ان لوگوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا جو اس پیغام کے حامل اور اپنے پیغمبر کے جانشین تھے لیکن اس کا مغربی اور شمالی حصہ یورپ مجاہدین اسلام کے حلقے سے باہر رہا۔ اس نے پوری نو صدیاں یا ایک ہزار سال جہالت اور ظلمت کے اس دور میں گزارے جس کو وہ خود اپنی زبان سے تاریک کہتا ہے۔ انسانی تاریخ کا یہ طویل زمانہ جو وحشت و جہالت، عقل دشمنی اور اوہام پرستی، رہبانیت کی مردم آزاری اور آدم بیزاری، اربابِ کلیسا کی آتش داروگیر اور ظالمانہ احتساب کی نذر ہوا۔ اس کا افسوس یورپ کو ہمیشہ رہے گا اور اس کی ندامت سے اس کی گردن ہمیشہ جھک جانی چاہیے۔ یہ سب کرشمہ تھا اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ (انھوں نے اپنے عالموں، راہبوں اور حضرت مسیح کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا) کا۔ سولھویں صدی میں جب اس کی آنکھیں

کھلیں تو اس نے خیال کیا کہ اس کی ساری مصیبتوں کا علاج یہ ہے کہ وہ کلیسا کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔ لیکن اس نے لا الٰہ کی پوری منزل طے نہیں کی۔ اُس نے لا کلیسا کو لا الٰہ کا مرادف سمجھا اور صرف کلیسا کی نفی کرنے کے بعد دوسرے الٰہ اپنے اوپر مسلط کر لیے۔ رہا اِلّا اللہ، تو اس کا تو اس نے آغاز ہی نہیں کیا۔ مغرب اپنی اہم ترین تاریخ کی ان تین صدیوں میں اپنے ایک ایک پسندیدہ اِلٰہ سے روٹھ کر دوسرے نئے نئے الٰہ تراشتا رہا اور اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ کا منظر نظر آتا رہا۔ آج بھی وہ اپنے بہت سے قدیم الٰہ سے بیزار نظر آتا ہے لیکن دوسرے آلہٰ باطلہ تراشتا جا رہا ہے۔ ان میں سے کسی اِلٰہ کا نام جمہوریت ہے۔ کسی کا نام آمریت (ڈکٹیٹرشپ)، کسی کا نام سرمایہ داری، کسی کا نام اشتراکیت، کسی کا نام قومی اشتراکیت، کسی کا نام قوم اور کسی کا نام وطن۔ مغرب اپنی زندگی کے نقشے اُدھیڑ اُدھیڑ کر بناتا اور اپنی زندگی کی گھڑی کے پرزے بکھیر بکھیر کر جماتا ہے لیکن اس کی چول نہیں بیٹھتی۔ اس اُلجھی ہوئی ڈور کو وہ برسوں سے اپنے ناخنِ تدبیر سے سلجھا رہا ہے لیکن جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ اُلجھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ اب اس میں خود اس کی انگلیاں اس طرح پھنس گئی ہیں کہ نکلتی نہیں۔

وہ زندگی کے ہزار نقشے بنائے اور ان میں ہزار ترمیمیں کرے اور ان کے نئے نئے نام رکھے، ایک شخص کی ذمہ داری بہت سے اشخاص پر منقسم کرے یا بہت سے اشخاص کی ذمہ داری ایک منتخب ترین اور ذمہ دار ترین پر ڈال دے اور اس شخص کو صدہا قیود و ضوابط سے جکڑ دے لیکن جب تک اس جسم کا قلب نہیں بدلتا، وہ ذمہ دار ایک فرد ہو یا کوئی جماعت یا پوری قوم جب تک اپنے آپ کو ایک بالاتر طاقت علیم و خبیر کے سامنے ذمہ دار نہیں سمجھتی جب تک اس کے دل میں خوف خدا اور آخرت کی باز پرس کا کھٹکا نہیں، خیر کا رجحان اور نیکی و امانت کا شعور نہیں، اس وقت تک محض ناموں کی تبدیلی سے اور قوانین و ضوابط سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

حضرات! سیرت محمدی کا اصل پیغام اس بیسویں صدی کی دنیا کے نام جس کی قیادت آج مغرب کے ہاتھ میں ہے، یہ ہے کہ اللہ سے بھاگنے والو اللہ کی طرف بھاگو اور اس کے سوا کسی کو اِلٰہ نہ بناؤ:

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الذاریات ۔۳)

پس بھاگو اللہ کی طرف۔ بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ بے شک میں اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں۔

یہ پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہر آن دنیا کو سناتی ہے اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک یہ دعوت پہنچاتی ہے۔ ہوا اپنے کاندھوں پر اور سمندر اپنے سر آنکھوں پر رکھ کر اس پیغام اور دعوت کو دنیا کے ملکوں اور قوموں کو پہنچا رہے ہیں اور دنیا کا یہ شور جو کچھ سننے نہیں دیتا اگر ذرا کم ہو تو اب بھی کان میں وہی آواز آ رہی ہے جس کو پہلی صدی کے اہلِ کتاب نے سنا تھا۔

قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (مائدہ ۔)

تمھارے پاس ایک روشنی اور ایک کھلی ہوئی کتاب آ گئی ہے جس کے ذریعے سے اللہ ہر اس شخص کو جو اس کی رضا کا پیرو ہو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

پیغمبر ہی انسانی جہاز کے ناخدا ہیں۔ انسانوں کی کشتی ہر زمانہ میں انھیں کی ناخدائی سے ساحل تک پہنچی ہے۔ یہ صرف حضرت

نوح کے فرزند ہی کی خصوصیت نہ تھی، ہر زمانہ میں جس نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ سَاٰوِیْۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ (میں تو پہاڑ پر پناہ لے کر طوفان سے محفوظ رہ جاؤں گا) اس کو یہی جواب ملا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (آج کوئی بچانے والا نہیں)۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہل مشرق اور اہل مغرب، اولین و آخرین سب کے لیے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انھیں کے دامن سے وابستہ ہے۔ ان سے علیحدہ ہو کر شقاوت اور ہلاکت، محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں۔

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا است ۔۔۔ کسے کہ خاکِ درش نیست، خاک بر سرِ او

حضرات! اس پیغام کا ایک حصہ مسلمانوں کے نام بھی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی دنیا کچھ ویران اور کوئی قبرستان نہ تھی۔ زندگی کا چکر جس طرح اس وقت چل رہا ہے بہت تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُس وقت بھی چل رہا تھا۔ سارے کاروبار آج کی طرح ہو رہے تھے۔ تجارت بھی تھی، زراعت بھی تھی اور حکومتوں کا نظام چلانے والے اور ان کی مشنری میں فٹ ہونے والے بھی موجود تھے۔ اس وقت کی دنیا کے لوگ اس زندگی پر بالکل قانع اور مطمئن تھے، اور ان کو اس میں کسی ترمیم یا اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنی زمین کا یہ نقشہ اور دنیا کی یہ حالت بالکل پسند نہ تھی۔ حدیث میں اس زمانہ کے متعلق ہے: ان اللہ نظر الی اھل الارض فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب (اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر نظر ڈالی، اس نے روئے زمین کے تمام باشندوں، کیا عرب اور کیا عجم سب کو بے حد ناپسند فرمایا اور وہ ان سے بیزار ہوا سوائے اہل کتاب میں سے چند افراد کے) ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ساتھ ایک پوری اُمت کے ظہور کا سامان کیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ نے ان کو کسی ایسے مقصد کے لیے پیدا کیا جو دوسری قوموں سے پورا نہیں ہو رہا تھا۔ جو کام وہ سب پورے انہماک اور شوق کے ساتھ انجام دے رہے تھے، اسی کام کے لیے تو ظاہر ہے کہ کسی نئی امت کو پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ انسانی زندگی کے سمندر میں اس نئے تلاطم کی کوئی حاجت تھی جو مسلمانوں کے وجود سے ظہور میں آیا اور جس نے زمین میں ایک زلزلہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو فرشتوں نے عرض کیا کہ تسبیح اور تقدیس کے لیے ہم نیازمند بہت کافی تھے، اس کے لیے اس خاکی پتلے کو پیدا کرنے کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، گویا اشارہ فرمایا (اور آگے چل کر واضح کر دیا) کہ آدم صرف اسی کام کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ صاحبو! اگر مسلمان صرف تجارت کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے تو مکہ کے ان تاجروں کو جو شام و یمن کا تجارتی سفر کیا کرتے تھے اور مدینہ کے ان بڑے بڑے یہودی سوداگروں کو جن کے بڑے بڑے گودام بنے ہوئے تھے یہ پوچھنے کا حق تھا کہ اس خدمت کے لیے ہم گناہ گار کیا کم ہیں کہ اس کے لیے ایک نئی امت پیدا کی جا رہی ہے۔ اگر زراعت مقصود تھی تو مدینہ اور خیبر کے، طائف اور نجد کے، شام و یمن اور عراق کے کاشتکاروں اور زراعت پیشہ آبادی کو یہ پوچھنے کا حق تھا کہ کاشتکاری اور زراعت میں ہم محنت و کوشش کا کونسا دقیقہ اٹھا رکھتے ہیں کہ جس کے لیے ایک نئی امت کی بعثت ہو رہی ہے۔ اگر دنیا کی چلتی ہوئی مشنری میں صرف فٹ ہونا تھا اور حکومتوں کے نظم و نسق اور دفتری کاروبار کو اجرت لے کر چلانا تھا تو روم و ایران کے کارپردازان حکومت کو یہ کہنے کا حق تھا کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہم بہت ہیں، اور ہمارے بہت سے بھائی بیروزگار ہیں، اس کے لیے نئے امیدوار کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن درحقیقت مسلمان بالکل ہی ایک نئے اور ایسے کام کے لیے پیدا کیے جا رہے تھے جو دنیا میں کوئی نہ انجام دے رہا تھا اور نہ دے سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک نئی امت ہی کی بعثت کی ضرورت تھی، چنانچہ فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (آل عمران : ۱۰)

تم بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسی مقصد کی خاطر لوگ وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی جمائی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا، دنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور ان کے سامنے آئی ہوئی فرصتیں ضائع کیں، پانی کی طرح اپنا خون بہایا اور اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی عورتوں کو بیوہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اُن مقاصد و مشاغل کے لیے جن پر آج مسلمان قانع نظر آتے ہیں اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی ضرورت نہ تھی، اُن کے حصول کا راستہ بالکل بے خطر اور ہموار تھا اور اس راستہ پر معاصر دنیا سے کوئی بڑی کشمکش اور تصادم نہیں تھا۔ اور نہ یہ اہلِ عرب اور دنیا کی دوسری قوموں کے لیے وجہِ شکایت تھی۔ انھوں نے تو بار بار انھیں چیزوں کی پیش کش کی جو آج عام مسلمانوں کا منتہا ہے اور ہر بار اسلام کے داعی نے اس کو ٹھکرایا، دولت و سرداری، عیش و عشرت اور راحت و تن آسانی کی بڑی سے بڑی پیش کش کو نامنظور کیا۔ پھر اگر مسلمانوں کو اسی سطح پر آجانا تھا جس پر زمانہ بعثت کی تمام کافر قومیں تھیں اور اس وقت بھی دنیا کی تمام غیر مسلم آبادی ہے، اور زندگی کے انھیں مشاغل میں منہمک و سرتاپا غرق ہو جانا تھا جس میں اہلِ عرب اور رومی و ایرانی ڈوبے ہوئے تھے، اور انھیں کامیابیوں کو اپنا منتہائے زندگی بنا لینا تھا جن کو ان کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے بہترین موقع پر رد کر چکا تھا، تو یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر پانی پھیر دینے کے مرادف ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ انسانوں کا وہ بیش قیمت خون جو بدر، احد، حنین، احزاب، قادسیہ اور یرموک میں بہایا گیا بے ضرورت بہایا گیا۔

آج اگر سردارانِ قریش کو کچھ بولنے کی طاقت ہو تو مسلمانوں کو خطاب کر کے وہ کہہ سکتے ہیں کہ تم جن چیزوں کے پیچھے سرگرداں ہو اور جن چیزوں کو تم نے اپنا حاصلِ زندگی سمجھ رکھا ہے انھیں چیزوں کو تو ہم گنہگاروں نے تمھارے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس وقت خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر حاصل ہو سکتی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا مقصود ہی نہ تھا، اُنھوں نے ادنیٰ توقف کے بغیر ان کو رد کر دیا۔ ہم بے شک کشتنی و گردن زدنی تھے لیکن مقصد کو نقصان پہنچانے کے لحاظ سے تم بھی بے گناہ نہیں ہو۔

حضرات! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے متعلق یہی خطرہ تھا کہ وہ دنیا میں پڑ کر اپنا اصل مقصد نہ بھول جائیں اور دنیا کی عام سطح پر نہ آجائیں۔ آپ نے وفات کے قریب جو تقریر فرمائی اس میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

ما الفقرَ أخشىٰ عليكم ولكني أخشىٰ أن تُبسط عليكم الدنيا كما بُسطت على من كان قبلكم فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم كما أهلكتهم (بخاری۔ مسلم)

مجھے تمھارے بارے میں کچھ فقر و افلاس کا خطرہ نہیں ہے، مجھے تو اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں تم کو بھی ویسی ہی کشائش نہ حاصل ہو جائے جیسی تم سے پہلے لوگوں کو حاصل تھی، پھر تم بھی اس میں اسی طرح حرص و مقابلہ شروع کر دو جیسے انھوں نے کیا، پھر تم کو یہ دنیا اسی طرح ہلاک کر دے جیسے ان کو ہلاک کیا۔

مدینہ کے انصار نے جب اس بات کا ارادہ کیا کہ جہاد کی مشغولیت اور اسلام کی جدوجہد سے کچھ دنوں کی فرصت حاصل

کرکے اپنے باغات، کھیتوں، اور کاروبار کو درست کرلیں اور کچھ مدت کے لیے صرف اپنے کاروبار میں مشغول ہونے کی اجازت حاصل کرلیں تو یہ خطرہ بھی ان کے دل میں نہ گذر سکتا تھا کہ وہ ارکان دین، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرالیں، لیکن اسلام کی عملی جدوجہد اور دین کے فروغ اور اس کے غلبہ کی کوشش سے ان کی اس عارضی یکسوئی کو بھی خودکشی کا مرادف قرار دیا گیا۔ چنانچہ اسی پر سورہ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○

اللہ کے راستہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو، اور اچھی طرح کام کرو، بے شک اللہ اچھے کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاری نے اس آیت کی یہی شان نزول بیان کی ہے۔

مسلمان کی زندگی کی اصلی اسلامی ساخت یہی ہے کہ یا تو اسلام کی عملی جدوجہد میں مشغول ہو یا عملی جدوجہد میں مشغول ہونے والوں کے لیے پشت پناہ و مددگار رہو اور اس کے ساتھ عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم اور شوق بھی رکھتا ہو۔ مطمئن شہری اور محض کاروباری زندگی اسلامی زندگی نہیں ہے اور کسی طرح بھی یہ ایک مسلمان کا مقصود حیات نہیں بن سکتی۔ جائز مشاغل زندگی، جائز وسائل معیشت ہرگز ممنوع نہیں، بلکہ نیت اجرطلبی کے ساتھ عبادت و قربت الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ مگر جب کہ یہ سب دین کے سایہ میں ہوں اور صحیح مقصد کا وسیلہ ہوں، نہ کہ خود مقصود بالذات۔

حضرات! سیرت محمدی کا یہ سب سے بڑا پیغام ہے جو خالص مسلمانوں کے نام ہے۔ اس کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے مقصد کو ضائع کرنا اس سب سے بڑی حقیقت کی طرف سے چشم پوشی ہے جو سیرت محمدی مسلمانوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

عبادت اور عبودیت

از افادات علامہ ابن تیمیہؒ

مترجمہ
(مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آیت کریمہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ (بقرہ - ۳) لوگو! اپنے رب کی "عبادت" کرو

کا کیا مطلب ہے؟ "عبادت" کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے اصول و فروع کیا ہیں؟ آیا دین پورے کا پورا اس لفظ عبادت میں داخل ہے یا نہیں، اور یہ لفظ دین کے تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے یا دین کے کچھ شعبے اس کی حدود سے خارج ہیں؟ عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا عبودیت ہی کسی مخلوق کے شرف و مجد کا منتہائے کمال ہے یا اس سے بلند تر کوئی مقام اور بھی ہے؟

امام موصوف اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

مفہوم عبادت کی وسعت

الحمد للہ رب العالمین "عبادت" ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت، صلہ رحمی، دیانت، اطاعت والدین، ایفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ اور پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ — خواہ یہ مملوک انسان ہوں خواہ بہائم — نیک سلوک، دعاء، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمال صالحہ صورت عبادت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ نیز اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کی محبت، رحمت خداوندی کی امید اور عذاب الٰہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر، شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ تمام صفات حسنہ عبادت کی حدود میں شامل ہیں۔ اور عبادت ہی اللہ تعالیٰ کی وہ غایت محبوب و مقصود وحید ہے جس کے لیے اس نے یہ سارا کارخانۂ عالم پیدا کیا۔ جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے:

تخلیق انسانی کی غایت مقصود

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (ذاریات - ۳) میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

اور دنیا میں جو رسول بھی بھیجا گیا، اسی غایت کے ساتھ اور اسی مقصد کی تذکیر و تبلیغ کے لیے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ۔ اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

پھر یہی بات حضرت ہود، صالح، شعیب اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم سے کہی۔ قرآن میں ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔

ہم نے ہر قوم میں ایک پیغام بر بھیجا یہ پیغام دے کر کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ۔

اے نبی! تم سے پہلے ہم نے جس پیغمبر کو بھی بھیجا اس کو ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔

إِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ۔

درحقیقت تم لوگوں کی یہ امت ساری کی ساری ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں سو میری عبادت کرو۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ ان آیات میں "فاعبدون" کا خطاب صرف عوام ہی یعنی امتیوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ خود اس دعوت کے داعی اور اس پیغام کے مبلغ انبیاء کرام بھی اس کے مخاطب اور مکلف ہیں، جس کی تصریح ایک دوسرے مقام پر اس طرح کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ۔ (مومنون - ۴)

اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک کام کرو۔ بلاشبہ میں تمہارے اعمال سے واقف ہوں۔

ایک دوسری آیت میں اسی چیز کو مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی زندگی کے آخری لمحوں تک کے لیے واجب ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ (حجر - ۶)

اے محمد! اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ "یقین" (موت) کا وقت آجائے۔

پھر یہی عبادت وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ انبیاء اور ملائکہ کی صفتِ کمال کے طور پر مداحانہ ذکر کرتا ہے:

وَلَهُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِندَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ، يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۰ (انبیاء - ۲)

آسمان اور زمین میں جو لوگ ہیں وہ سب اسی کے ہیں۔ جو ملائکہ اس کے حضور میں ہیں وہ نہ کبھی اس کی عبادت سے سرتابی کرتے ہیں نہ کاہلی کرتے ہیں، رات دن اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس میں ذرا بھی نہیں تھکتے۔

فَالَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ۔

جو ملائکہ تیرے رب کے پاس ہیں وہ کبھی اس کی عبادت سے کبر و اعراض نہیں کرتے، ہر دم اس کی تسبیح کرتے رہتے اور اس کی جناب میں سربسجود رہتے ہیں۔

اس کے بالمقابل جو لوگ کائنات عالم کی اس غایت آفرینش کو پورا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی اور سرافگندگی کا اظہار کرنے کے بجائے استکبار سے کام لیتے ہیں ان کی اللہ تعالیٰ یوں مذمت کرتا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

اور تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھے پکارو، میں تمہاری سنوں گا۔ بے شک جو لوگ عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ دوزخ میں ذلیل و خوار داخل ہوں گے۔

عبدیت۔ بندے کے لیے بلند ترین مقام | عبادت ہی جب تکوینِ عالم کی غرض وغایت ٹھہری تو اس غرض کا پورا کرنا ہی خالقِ ارض وسما

کی خوشنودی کا باعث ہوا، اور کسی مخلوق کی انتہائی برتری اور برگزیدگی کے معنی یہ ہوئے کہ وہ عبدیت کے انتہائی مقام پر پہنچا ہوا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جب اپنے خاص اور مقرب بندوں کا شفقت و محبت اور اعزاز و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہے تو انھیں اسی صفت عبدیت سے متصف کرتا ہے اور ان کا تذکرہ "عبد" کے لفظ سے کرتا ہے :-

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (دھر - ۱) — ایک چشمہ جس سے عباد اللہ (اللہ کے بندے) سیراب ہوں گے۔

عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا — رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔

جب شیطان نے اپنی ملعونیت کی سزا سن کر اللہ کے حضور کہا کہ میں اس کے بدلے میں تیرے بندوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر گمراہ کروں گا تو بارگاہ رب العزت سے ارشاد ہوا :-

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ (حجر - ۳) — بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا کوئی بس نہ چلے گا بجز ان گمراہوں کے جو تیرا اتباع کریں۔

ملائکہ کے متعلق فرمایا :

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ..... وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء) — اور یہ کافر کہتے ہیں کہ رحمٰن نے اپنی اولاد بنائی ہے۔ پاک اور منزہ ہے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے۔ بلکہ وہ تو اللہ کے مکرم بندے ہیں اور وہ خوف سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا .... — آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ اللہ کے حضور عبد و بندہ ہو کر حاضر ہوگا۔

حضرت مسیح کے بارے میں جن کے متعلق نبوت کے ساتھ ساتھ الوہیت کا بھی دعویٰ کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ کہتا ہے :

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (زخرف - ۶) — وہ تو محض ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا۔

چنانچہ اسی لیے کہ کہیں مسلمان بھی پیغمبر آخر الزمان کے معاملہ میں یہی غلطی نہ کر بیٹھیں کہ انھیں ان کے اصلی مقام —— مقام عبدیت —— سے ہٹا دیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی امت کو کھلے لفظوں میں وصیت فرما دی کہ :

لا تطروني كما اطرت النصارى عيسى ابن مريم. انما انا عبد فقولوا عبد الله ورسوله (الحدیث) — میری مدح و ستائش میں غلو نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو مراہ کر حد سے بڑھا دیا۔ میں تو محض ایک بندہ ہوں سو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا۔

عام بندگان خاص اور ملائکہ اور دیگر انبیائے کرام کی طرح خیر خلق اور سرور عالم کا ذکر بھی اسی لفظ "عبد" سے ہوتا ہے۔ معراج جیسے مایۂ صد ناز و عظمت مآب واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے :

سُبْحٰنَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ...... — پاک و برتر ہے وہ خدا جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا......

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى۔ — اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کی، کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ رسالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ — اور جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے (قرآن پڑھنے) کے لیے کھڑا ہوا

عَلَيْهِ لِبَدًا۔ (جن - ۱) — تو وہ اس پر پل پڑے۔

منکرین قرآن کو چیلنج دیتے اور رسول کریم کی طرف سے تحدی کرتے ہوئے کہا جاتا ہے:

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ۔ — اور اگر تم اس چیز (قرآن) کے (منجانب اللہ ہونے کے) بارے میں شک میں ہو جس کو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو پھر اس جیسی ایک ہی سورۃ بنا کر مقابلہ میں لاؤ۔

دین اور عبادت کا ترادف ان آیات و نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ عبدیت مخلوق کے شرف و مجد اور عظمت و سعادت کی معراج کمال ہے اور اس کے آگے بلندی کا کوئی مقام باقی نہیں رہ جاتا، وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ "عبادت" میں سمٹا ہوا ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے جیسا کہ قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح موجود ہے۔ اور پھر ہر نبی نے "فاعبدوہ" کا درس دیا، معلوم ہوا کہ "دین" اور "عبادت" ایک ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں ہیں بخاری کی مشہور حدیث جبریل اس امر کی پوری وضاحت کر دیتی ہے۔ جبریل علیہ السلام ایک اعرابی کی شکل میں بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور آتے ہی صحابہ کرام کے سامنے رسول اکرم صلعم سے اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کیے کہ "اسلام کیا ہے؟" تو رسول اللہ نے جواب دیا "اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرط استطاعت حج کرو۔" پھر پوچھا کہ "ایمان کی کیا تعریف ہے؟" ارشاد ہوا "ایمان نام ہے خدا کی وحدانیت پر، اس کے فرشتوں پر اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر اور احوال و واقعات عالم کو، خواہ وہ خیر ہوں یا شر، نوشتۂ تقدیر کا پابند ہونے پر دل سے یقین لانے اور رکھنے کا۔" پھر سوال کیا کہ "احسان کسے کہتے ہیں؟" فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت کرو اس طرح کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمھیں دیکھ ہی رہا ہے۔" جب جبریل علیہ السلام یہ سوال و جواب کر کے چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا "دین" سکھانے آئے تھے۔"

دیکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام چیزوں کو "دین" فرمایا درآں حالے کہ انہی تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام "عبادت" بھی ہے۔

"دین" اور "عبادت" کی لغوی تحقیق آؤ، "دین" اور "عبادت" کے الفاظ پر غور کر کے دیکھیں کہ لغت میں ان کا مفہوم اور مدلول کیا ہے؟

دین کے لغوی معنی ہیں عاجزانہ سرفگندگی، خضوع اور تذلل۔ اہل عرب کہتے ہیں "دِنْتُہٗ فَدَانَ"۔ یعنی میں نے اس کو ذلیل و ناچار اور اپنا مطیع و منقاد بنایا اور وہ ایسا بن گیا۔ "نَدِيْنُ اللّٰهَ وَنَدِيْنُ لِلّٰهِ" یعنی ہم خدا کی بندگی و اطاعت کرتے ہیں اور اپنے کو اس کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ پس اللہ کے دین کا مطلب ہوا اس کی اطاعت، بندگی اور اس کے سامنے اظہار تذلل و سرفگندگی۔

عبادت کا لغوی مفہوم بھی اسی کے قریب قریب ہے اور اس لفظ کے معنی بھی تذلل اور انقیاد تام کے ہیں، چنانچہ اہل عرب اس راستہ کو جو کثرت آمد و رفت کی وجہ سے راہ گیروں کے قدموں سے خوب روندا گیا ہو اور بالکل صاف اور ہموار ہو گیا ہو۔ "طریق مُعَبَّد" کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاح شریعت میں عبادت کا مفہوم اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ خضوع اور تذلل کے ساتھ اس میں محبت کا عنصر بھی شامل ہے، اور عبادت شریعت کی زبان میں اللہ تعالیٰ کے روبرو انتہائی تذلل اور کامل محبت دونوں کے مجموعے کا نام ہے، چنانچہ اسی بنا پر لغت عرب میں "تیم" کا لفظ عبد کے معنی میں آتا ہے اور تتیم محبت کے آخری درجہ کا نام ہے۔ جس طرح کہ اس کے پہلے درجہ کو "علاقہ"، دوسرے کو "صبابۃ"، تیسرے کو "غرام"، چوتھے کو "عشق" کہتے ہیں۔ پس متیم وہ شخص ہوا جو اپنے محبوب میں بالکل کھو گیا اور اس کے سامنے بالکل بچھ گیا ہو یعنی اس کا کامل غلام اور مُعَبَّد ہو۔ متیم اور تیم

کے الفاظ کا عبد کے معنی میں آنا خود گواہی دیتا ہے کہ عبادت کے اندر محبت کا بلکہ عشق کامل کا بھی مفہوم موجود ہے۔ پس اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے سامنے جھکتا تو ہے مگر ارادت و محبت کے بجائے بغض اور کراہت قلبی کے ساتھ جھکتا ہے، یا وہ ایک شخص سے محبت تو کرتا ہے مگر اس کے سامنے فروتنی اور سرافگندگی کا اظہار نہیں کرتا، جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے سے یا ایک دوست اپنے دوست سے محبت رکھتا ہے تو ایسی حالت میں اس کو عبد یا عابد نہ کہا جائے گا۔

لفظ عبادت کی اس تشریح کو سامنے رکھیے تو یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے کہ شریعت نے جس عبادت الٰہی کا ہمیں حکم دیا اور ہمارا مقصد زندگی قرار دیا ہے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا اگر اس کے اندر ان دونوں چیزوں میں سے صرف ایک ہی چیز ہو، اور اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بندہ کے نزدیک کائنات کی ہر شے سے زیادہ محبوب اور ہر چیز سے زیادہ مکرم و محترم ہو، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کامل محبت اور کامل تعظیم و تکریم کا مستحق صرف اللہ ہی ہے اور ہر وہ محبت غلط اور فاسد ہے جو غیر اللہ سے کی جائے اگر اللہ کے لیے نہ ہو۔ نیز ہر وہ تعظیم اصلاً باطل اور ناروا ہے جو کسی ماسوا کی کی جائے اور فرمان الٰہی کے ماتحت نہ ہو۔ حق تعالیٰ کا کہنا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط (توبہ - ۳)

اے نبی مسلمانوں سے کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، بیٹے اور بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان، تمھارے وہ مال جن کو تم نے کما رکھا ہے، تمھاری وہ عزیز تجارتیں جن کے سرد پڑ جانے کا تمھیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور تمھارے وہ مکانات جن کو تم بہت پسند کرتے ہو۔ اگر یہ تمام چیزیں تمھارے نزدیک اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو ٹھیرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم سامنے لے آئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محبت اصلاً خدا ہی کا حق ہے اور نبی کی محبت بھی اس کی تبعیت میں ہے، لیکن بہرحال شرعی طور پر اصل محبت خدا اور رسول دونوں سے ہونی چاہیے جس طرح اطاعت مطلق اور طلب رضا دونوں کی ہونی چاہیے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (اللہ اور رسول اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ یہ لوگ انھیں خوش رکھیں)۔ نیز صاحب حکم و امر دونوں ہی ہیں، وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (اور کاش یہ لوگ راضی ہوتے اس چیز پر جس کو اللہ اور رسول نے انھیں دیا تھا)۔ لیکن یاد رہے کہ عبادت اور اس کے لوازم مثلاً توکل، اور خوف و رجا وغیرہ کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور ان امور میں اس کا رسول کسی حیثیت سے بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ

(آل عمران - ۷)

اے نبی کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے تمھارے درمیان برابر ہے یعنی یہ کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ پھر اگر یہ لوگ تمھاری بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم (اس امر حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے) ہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ

اور کیا خوب ہوتا اگر وہ لوگ راضی ہو جاتے اس چیز پر جس کو اللہ اور

قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (توبہ - ۷)

اس کے رسول نے انہیں دیا تھا اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے وہ اپنے فضل سے ہم کو آئندہ بھی دے گا اور اس کا رسول، ہم تو خدا ہی کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔

دیکھو، اس آیت سے دونوں باتیں ثابت ہوگئیں، یہ بھی کہ صاحب امر و نہی اللہ بھی ہے اور اس کا رسول بھی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اس کی تصریح موجود ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر - ۱)

جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو، اور جس چیز سے روکیں اس کو چھوڑ دو۔

اور یہ بھی کہ "حسب" یعنی کفایت کنندہ اور کارساز کل اور معتمد علیہ صرف اللہ جل شانہ ہے، اور اس حقیقت کو ایک زائد آیتوں میں بوضاحت بیان کر دیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران - ۱۸)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے مقابلے کے لیے (بڑی جمعیت اور سامان) فراہم کیا ہے، سو ان سے ڈرو، تو (بجائے ڈرنے کے) ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انفال - ۸)

اے نبی! تمہارے لیے اور تمہارے پیرو کار مسلمانوں کے لیے[1] اللہ کافی ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۔

کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں۔

عبدیت کی تحقیق اب ہم لفظ "عبد" اور "عبادت" پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں، "عبد" کے دو معنی ہیں، "متعبَّد" اور "عابد"۔ معبَّد یعنی مشیت الٰہی کے فیصلوں کا زیر فرمان، تابع اور مجبور محض غلام، جو خدا کے احکام قضا کے سامنے طبعی اور فطری طور پر بالکل جھکا ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے احوال و معاملات کو جس طرح چاہتا ہو، بناتا، بگاڑتا اور الٹتا رہتا ہو۔

عبدیت کا تکوینی مفہوم اس معنی کے اعتبار سے کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ، بغیر استثنا کے خدا کا عبد ہے۔ نیکوکار ہوں یا بدکار، مومن ہوں یا کافر، متقی ہوں یا فاجر، اہل جنت ہوں یا اہل نار، سب کے سب یکساں طور پر عبد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کا رب ہے، سب کا مالک اور خالق ہے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی مشیت اور قضا و قدر سے یک سر مو باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے، خواہ اس کے ظہور میں آنے کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ کی جائے۔ اسی طرح جو کچھ وہ نہیں چاہتا وہ کبھی صورت وجود اختیار نہیں کر سکتا، خواہ اس کی کتنی ہی شدید تمنا کیوں نہ کی جائے۔ یہی قانون فطرت ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں حالانکہ جو

[1] بعض لوگوں نے "مَنْ" کو "اللہ" کے لفظ پر عطف مانا ہے اور ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "اے نبی تمہارے لیے اللہ اور تمہارے مومن متبعین کافی ہیں" لیکن آیت کا مفہوم سمجھنے میں ان لوگوں نے بڑی فحش غلطی کی ہے، ایسی فاحش غلطی کہ جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن کے مسلمہ کلیات کے یہ بات سراسر خلاف ہے۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۔ (آل عمران ـ ۹)

اور جو کوئی بھی آسمان اور زمین میں ہے، چاروناچار اس کے سامنے سرنگوں ہے اور اسی کے حضور یہ سب لوٹائے جائیں گے ۔

پس اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے، وہی سب کا پروردگار ہے، سب کا خالق ہے، سب کا رازق ہے، سب کا زندگی بخشنے والا ہے، سب کا مارنے والا، سب کے دلوں کو پھیرنے والا اور سب کے عواقب و احوال کے اندر حسب منشا تصرف کرنے والا ہے ۔ اس کے سوا کوئی بھی اس کائنات کا رب، خالق اور مالک نہیں ہیں، خواہ کوئی اس امر بدیہی کا اعتراف کرے یا نہ کرے اور اس حقیقت تاباں سے واقف ہو یا نہ ہو۔

عبدیت کی اس منزل میں تو اہلِ ایمان اور اہلِ کفر، دونوں ہی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں لیکن اب اس سے آگے چل کر دونوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور دونوں کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھنچ جاتا ہے ۔ اہلِ ایمان تو ان حقائق کا علم بھی رکھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں ان پر اذعان اور یقین بھی رکھتے ہیں، لیکن جو ایمان کی روشنی سے محروم ہیں، وہ یا تو ان حقائق کا جیسا کہ چاہیے، علم نہیں رکھتے یا پھر علم تو رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انکار کرتے ہیں، پروردگارِ حقیقی کے خلاف اپنی کبریائی کا علم بلند کر دیتے ہیں اور اس کے سامنے جھکنے اور سرِ عجز و نیاز خم کرنے کے بجائے استکبار کی روش پر جم جاتے ہیں، گو اندر سے ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ نے ہی انھیں پیدا کیا ہے اور وہی انھیں رزق بھی دیتا ہے ۔ یہ دونوں ہی قسم کے منکرینِ حق، ایمان و کفر کے لحاظ سے ایک ہی پوزیشن رکھتے ہیں اور دوسری قسم کے باغیانِ حق کا علم و اعتراف ان کی حیثیتِ ایمانی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا کیونکہ انکار اور سرکشی کے ساتھ معرفتِ حق، علامتِ ایمان اور موجبِ نجات نہیں بلکہ اور زیادہ باعثِ عذاب ہے ۔ فرعون اور فرعونیوں کے حق میں قرآن فرماتا ہے :

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ؟ (نمل ـ ۱)

باوجود اس کے کہ ان کے قلوب خدا کی نشانیوں کی صداقت کا یقین رکھتے تھے لیکن انھوں نے ظلم اور کبر کی بنا پر انکار کر دیا، سو دیکھو کہ ان مفسدوں کا کیسا انجام ہوا ؟۔

اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا :۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ ـ ۱۷)

جن لوگوں کو (پہلے) ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن یا صاحبِ قرآن) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو، اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے امرِ حق کو چھپاتا ہے ۔

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۔

دراصل یہ لوگ تمھیں نہیں جھٹلاتے (بلکہ دل میں تمھیں سچا سمجھتے ہیں) لیکن یہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

بہرحال بندہ کا اللہ تعالیٰ کے متعلق صرف اس قدر علم و اعتراف کہ وہی اس کا پروردگار اور خالق ہے اور وہ ہر حال میں اس کا محتاج اور نیازمند ہے، اپنی صرف اُس عبودیت کا اقرار ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے ۔ ایسا بندہ اپنے ربِ حقیقی کے سامنے بوقتِ ضرورت دستِ سوال بھی پھیلایا کرتا ہے، اس کے سامنے گڑگڑاتا بھی ہے اور اس پر توکل بھی رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے احکام کی اطاعت میں ثابت قدم نہیں نکلتا۔ وہ کبھی ان کو مانتا ہے، کبھی نہیں مانتا، کبھی خدا کے روبرو جھکتا ہے تو کبھی شیاطین و اصنام کے سامنے سجدہ ریز نظر آتا ہے ۔ سو اس قسم کی عبودیت ـــ یعنی اللہ تعالیٰ کی محض صفتِ ربوبیت کے فہم و یقین ـــ

سے کسی شخص کے باایمان ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اس یقین سے اہلِ جنت اور اہلِ نار کے درمیان کوئی تفریق ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا ایمان اپنے وجود و عدم کے لحاظ سے یکساں ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ

اور ان میں سے بیشتر تو اس طرح خدا پر ایمان رکھتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں۔

مشرکین کو کبھی اس سے انکار نہ تھا کہ اللہ ہی سب کا خالق اور رازق ہے اور نہ قرآن حکیم نے کبھی ان پر یہ الزام رکھا کہ وہ خدا کی خالقیت اور رازقیت کو کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ اس کا ان پر الزام صرف یہ تھا کہ اس علم و اقرار کے باوجود کہ خدا ہی سب کو وجود بخشتا اور سامانِ زیست بہم پہنچاتا ہے، اور دوسروں کو کیوں اس کی معبودیت میں حصہ دار بناتے ہیں:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ (عنکبوت)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے اور سورج چاند کس نے مسخر کیے تو جواب دیں گے اللہ نے۔

قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۞ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۞ قُلْ مَنْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۞ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۞ قُلْ مَنْ بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۞ سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ فَأَنَّى تُسْحَرُونَ ۞ (مومنون-۵)

ان سے کہو، (ذرا بتاؤ تو سہی) یہ زمین اور اس کے بسنے والے کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو۔ جواب دیں گے اللہ کے۔ کہو، تو کیا پھر بھی تم کو ہوش نہیں آتا؟ پوچھو کہ ساتوں آسمان اور بزرگی والے تخت کا رب کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ کہو، تو کیا پھر بھی تم نہیں ڈرتے۔ پھر دریافت کرو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر شے کی بادشاہت اور حکمرانی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔ (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو! جواب دیں گے اللہ ہی کی (ساری کائنات کی حکومت ہے)۔ کہو، تو پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑا ہے (کہ تمھاری عقل یوں ماری گئی)۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار مشکل ہی کوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان کر سکتا ہے۔ ہر شخص کو ایک ادنیٰ تامل اور تفکر اس حقیقت تکوینی کا مشاہدہ کرا سکتا ہے۔ چنانچہ خدا کے مسلم اور فرماں بردار بندوں ہی کی یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس کے باغی اور نافرمان بندے بھی اس حقیقت کو اسی طرح مانتے ہیں جیسا کہ اہلِ ایمان۔ حتیٰ کہ ابلیس لعین بھی اپنی تمام ڈھٹائیوں کے باوجود اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکا اور اپنی سزائے ملعونیت سننے کے بعد بھی اس کے منہ سے سب سے پہلے یہی نکلا کہ:-

رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (حجر-۳)

اے رب! تو مجھے اس دن تک کے لیے مہلت دے جبکہ مردے اٹھائے جائیں گے۔

رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (حجر-۳)

اے رب جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی یقیناً ان انسانوں کو زمین میں سبز باغ دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ۔

قسم ہے تیرے عزو جلال کی میں ضرور ان سب کو جادۂ حق سے پھیر دوں گا۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں وہ اس بات کا علانیہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ ہی اس کا اور سب کا پروردگار اور خالق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اسی طرح اہلِ جہنم بھی اس اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے وہ اس امر کا اقرار کریں گے کہ:

رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ (مومنون-۷)
وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا (انعام - ۳)

اے ہمارے رب! ہم پر ہماری بدبختی سوار ہوگئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ کاش کہ تم اُن لوگوں کو اس وقت دیکھتے جب کہ اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو جواب دیں گے کیوں نہیں، قسم ہے ہمارے رب کی (یہ سب حق ہے)

پس جو شخص اسی حقیقتِ تکوینی کی حد تک پہنچ کر رک جاتا ہے اور اس عبدیت سے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے، آگے قدم بڑھا کر حقیقتِ تشریعی کی حدود میں داخل نہیں ہوتا اور اس عبدیت کا قائل اور حامل نہیں بنتا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی الٰہیت، معبودیت اور اس کی اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت سے ہے، وہ کسی طرح بھی ابلیس اور اہلِ جہنم کے مقابلہ میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا، دراصل وہ انہی کی جنس اور زمرہ میں شامل ہے۔ اور اگر اس کے باوجود وہ اپنے تئیں یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان "بندگانِ خاص" اور "اولیاء مقربین" اور "پہنچے ہوئے عارفین کاملین" میں سے ہے جن سے تکلیفِ شرعی ساقط ہوگئی ہے تو وہ کافروں اور ملحدوں سے بھی بدتر اور گمراہ تر انسان ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ حضرت خضر یا کوئی اور احکامِ شرع کا مکلف نہیں اس لیے کہ اس کو ارادۂ الٰہی اور اسرارِ تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہے، تو اس کا یہ گمان اور قول منکرین خدا کے اقوال اور اوہام اور اباطیل سے بھی زیادہ بیہودہ ہے۔

عبد اور عبدیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے جس کی اب تک اوپر کی سطروں میں توضیح ہوئی، اور جیسا کہ یہ بھی بیان ہو چکا کہ عبدیت کے اس مفہوم کے لحاظ سے ہر شخص خدا کا عبد ہے، مومن بھی اور کافر بھی، حتیٰ کہ جس طرح ایک نبی اسی طرح ایک شیطان رجیم بھی۔ اور یہ عبدیت، نجات و کامرانی آخرت کے لیے ذرا بھی مفید نہیں جب تک کہ انسان اس سے آگے بڑھ کر عبدیت کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے عبد نہ بن جائے۔

عبدیت کا دوسرا مفہوم

"عبد" کا دوسرا مفہوم "عابد" ہے، یعنی بندہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرے، کسی دوسرے کے سامنے اپنی پیشانی نہ جھکائے، اس کے اور اس کے رسولوں کے احکام کی اطاعت کرے، اس کے صالح اور متقی بندوں سے رابطہ محبت رکھے اور اس کے نافرمان اور باغی بندوں سے ترکِ تعلق کر لے۔ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے ایسا بندہ عبدیت سے خارج ہے جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی عبادت اور اطاعت نہیں کرتا، یا اس کے ساتھ کسی دوسرے "الٰہ" کی بھی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ کسی ذات کو الٰہ تسلیم کرنے کے معنی یہی ہیں کہ انسان کا قلب انتہائی محبت اور رغبت اور پوری تعظیم و تکریم اور خوف و رجا، صبر و شکر اور انابت و توکل کے گہرے جذبات کے ساتھ اسی کی طرف مائل ہو۔ پس جب یہ بندۂ اللہ کے ماسوا بھی کسی کو معبود اور الٰہ بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے جذباتِ عبودیت اور احساساتِ شوق و محبت کو تقسیم کر دیتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسا شخص عموماً اپنی ساری متاعِ نیاز غیر اللہ ہی کے حضور ڈال دیا کرتا ہے۔

عبدیت اور عبادت کا یہ پہلو اللہ تعالیٰ کی الٰہیت سے تعلق رکھتا ہے یعنی اس کی الٰہیت کا مقتضا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ توحید کا عنوان ہے لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی الٰہ اور معبود نہیں) یہی وہ عبادت ہے جو خدا کی نگاہ میں محبوب و مرغوب ہے، اسی عبدیت کا وہ اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، اسی عبودیت کو وہ اپنے صالح اور برگزیدہ بندوں کی صفتِ امتیاز اور وجہِ بزرگی قرار دیتا ہے اور اسی کی تبلیغ و تذکیر کے لیے وہ اپنے پیغمبروں کو دنیا میں بھیجتا رہا ہے۔ اس کے بالکل برعکس، در بالمقابل عبد اور عبدیت کا پہلا مفہوم ایک ایسی چیز ہے جس کا رضائے الٰہی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ جیسا کہ اوپر گزر چکا، اس میں کافر و مومن برابر کے شریک ہیں، ایک کافر بھی ان معنوں میں، ویسا ہی عبد ہے جیسا کہ ایک مومن۔

حقائق تشریعی و حقائق تکوینی میں فرق کرنے کے نتائج

"عبادت" کے ان دونوں مفہوموں میں جو فرقِ عظیم ہے اس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد وہ فرق بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے جو حقائقِ تشریعی اور حقائقِ تکوینی کے درمیان ایمان کے علم و اعتراف کے درمیان ہے۔ حقائقِ تشریعی یا دینی تو وہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی اطاعت، عبادت و شریعت سے ہے، جو اس کی رضا کا ذریعہ ہیں اور جن کے ماننے والوں کو وہ اپنی دوستی اور ولایت کی سندِ افتخار عنایت کرتا ہے۔ اور حقائقِ تکوینی وہ حقیقتیں ہیں جن کا تعلق اولیاء الشیطان سے بھی اسی قدر ہے جس قدر اولیاء الرحمٰن سے ہے۔ یعنی اگر ایک شخص محض انہی حقائق کے تسلیم کر لینے پر اکتفا کرتا ہے اور ان سے آگے بڑھ کر حقائقِ تشریعی کا علم و اذعان بھی عملاً اپنے اندر نہیں پیدا کر لیتا، تو وہ پیروانِ ابلیس کے زمرہ میں شامل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص حقائقِ تکوینی ہی کے تسلیم کر لینے اور انہیں کے مطابق اپنی زندگی کا نظام چلانے پر اکتفا تو نہیں کرتا بلکہ حقائقِ دینی کا بھی اس کے دل و دماغ میں دخل ہے مگر پوری طرح نہیں ہے بلکہ بعض امور میں تو وہ ان حقائق کی روشنی قبول کرتا ہے اور کچھ دوسرے امور میں ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے، تو ایسا شخص ایک ناکمل مومن ہے اور خدا کا ناقص پرستار۔ اس کے ایمان میں اسی قدر کمی اور نقص ہے جس قدر کہ وہ حقائقِ دینیہ کے اتباع سے گریز کرتا اور علمی یا عملی طور پر ان کا انکار کرتا ہے۔

یہ ایک اہم تشریح ہے اور بڑا ہی نازک مقام ہے جہاں کتنوں ہی کے قدم راہِ راست سے منحرف ہو گئے اور حق کی شاہراہ سے دور جا پڑے۔ خصوصاً اہلِ سلوک کو اکثر اس مقام پر سخت اشتباہات سے دوچار ہونا پڑا اور ایسے بے شمار اکابر شیوخِ طریقت ہیں جنہوں نے یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں جن کو تحقیقِ حق اور توحید و معرفتِ الٰہی کا راز داں کہا جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> "بہت سے لوگ ہیں کہ جب وہ قضا و قدر کے پاس پہنچے (یعنی انہیں ارادۂ الٰہی کا مشاہدہ نصیب ہوا) تو وہیں ٹھہر گئے۔ لیکن میرا حال یہ نہیں ہے، بلکہ میں وہاں پہنچا تو میرے لیے روزن اس میں ایک کھڑکی کھلی اور میں نے قدرِ ارادۂ الٰہی سے ۔۔۔ حق کے ساتھ اور حق کے لیے ۔۔۔ جنگ کی ۔۔۔ مرد وہ ہے جو قدر کا مقابلہ کرتا ہے، نہ کہ وہ جو اس کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔"

شیخ ممدوح کا یہ فرمانا عین مدعائے شریعت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں امر فرمایا ہے اور جس کی اس کے رسول نے ہم کو تعلیم دی ہے۔ لیکن بہتیرے یہاں پہنچ کر بھٹک گئے اور سر رشتۂ حق ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اور یہ اس طرح پر کہ جب کبھی وہ سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے قضائے الٰہی کے قریب جا پہنچتے ہیں اور وہاں ان گناہوں اور معصیتوں کا ۔۔۔ حتیٰ کہ شرک اور کفر جیسی معصیتوں کا ۔۔۔ مشاہدہ کرتے ہیں جو ان پر یا دوسروں پر مقدر ہو چکی ہوتی ہیں، اور انہیں نظر آتا ہے کہ ان معصیتوں کا وقوع اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا کے مطابق ہونے والا ہے، یعنی وہ اس کے احکامِ ربوبیت اور مقتضائے مشیت کے تحت (نہ کہ اس کی رضا کے اندر) داخل ہیں تو ان کی عقل و فہم پر یہ خیال غلبہ پا لیتا ہے کہ بس اب یہ جو کچھ قضائے خداوندی میں طے ہو چکا ہے اس کے سامنے سرِ تسلیم و نیاز خم کر دینا، بلکہ اس پر راضی ہو جانا ہی دین و شریعت اور عبادت و طریقت ہے۔ لیکن ذرا غور تو فرمائیے کتنا خطرناک خیال ہے جو ان مشرکین کے خیالات سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا — اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہی ہمارے باپ دادا، شرک کرتے اور نہ

حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (انعام ۱۸) — کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔

لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَاهُمْ (زخرف ۲) — اگر رحمان چاہتا تو ہم ان بتوں کو نہ پوجتے۔

أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ أَطْعَمَهُ (یٰسین ۳) — کیا ہم انھیں کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟

لیکن اگر ان لوگوں کو ہدایت کی روشنی نصیب ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا کا وہ مقصد ہرگز نہیں ہے جو خیرہ نگاہی کے باعث انھوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم پر جو مصیبت بھی پڑے، ہم اس پر صبر کریں، اور یہ یقین کرکے کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہے، جس کا ہم پر نازل ہونا ناگزیر تھا، اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرلے جائیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ۔ — جو مصیبت بھی کسی کو پہنچی وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچی۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو راہ راست سجھا دیتا ہے۔

بعض علمائے سلف کی تفسیر کے مطابق "مَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهُ" سے مراد وہ شخص ہے جو مصائب دنیا میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے اندر یہ یقین بیدار ہو جاتا ہے کہ یہ سارے آزار خدا ہی کی طرف سے ہیں، پھر ان پر جزع فزع کرنے کے بجائے اس کے قلب پر صبر و رضا کا سکون چھا جاتا ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ:۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (حدید ۳) — زمین میں اور خود تمھارے اپنے اوپر جو مصیبت بھی نازل ہوتی ہے وہ قبل اس سے کہ ہم اس کو عالم وجود میں لے آئیں ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ بے شک کہ یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے (اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو) تاکہ کسی چیز کے ہاتھ نہ آنے کا تمھیں افسوس ہو اور نہ کسی چیز کے ملنے کی از حد خوشی۔

صحیح بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے کہ "حضرت آدم اور موسیٰ علیہما السلام میں بحث ہوئی، حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ آپ وہی آدم ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور آپ کے پتلے میں اپنی روح پھونکی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے "اسماء" کا آپ کو علم بخشا، پھر آپ نے ہیں، اور خود اپنے کو جنت کی نعمتوں سے کیوں نکال باہر کیا؟" حضرت آدم نے جواب دیا "آپ وہی موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے نوازا اور اپنے پیغام کا حامل اور مبلغ بنایا اور شرف نبوت عطا کیا تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ بات میرے حق میں، میری آفرینش سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی (یا نہیں)؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں (یہ تو صحیح ہے)۔"

مباحثہ کی یہ روداد بیان کر چکنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ "اس مباحثہ میں حضرت آدم نے حضرت موسیٰ کو قائل کر دیا"۔

دیکھو حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنے کو بے قصور ٹھیرانے کے لیے قضا و قدر کا نام نہیں لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قضا و قدر سے استدلال کرنا جاہل اور معصیت پرست کا کام ہے نہ کہ کسی مومن اور مسلم کا اس لیے کہ

اگر یہ چیز کسی کے گناہ کے لیے عذر ہو سکتی ہے تو ہر کافر اور عاد و ثمود جیسی گمراہ اور مغضوب قوم حتیٰ کہ ابلیس تک کو اس بنا پر معذور سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے جو کچھ کیا، مشیتِ الٰہی کے مطابق کیا۔

پھر حضرت موسیٰ کے اسلوبِ اعتراض پر بھی غور کرو کہ انھوں نے حضرت آدم کو ان کے ارتکابِ گناہ پر کوئی ملامت نہیں کی کیونکہ ان کا یہ گناہ بارگاہِ الٰہی سے بخشا جا چکا تھا اور حضرت آدم مغفرت، ہدایت اور نبوت کے سہ گانہ انعامات سے سرفراز ہو چکے تھے بلکہ ان کو ملامت اس مصیبت کی بنا پر کی جو ان کی لغزش کی وجہ سے تمام بنی نوعِ انسان پر نازل ہوئی اور انھوں نے حضرت آدم سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے ہمیں جنت سے کیوں نکالا" جس کا جواب بھی حضرت آدم نے وہی دیا جو دینا چاہیے تھا کہ "یہ بات تو میرے عالمِ آب و گل میں آنے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی"۔ یعنی یہ لغزش اور اس لغزش کی یہ سزا دونوں ہی نوشتۂ ازل میں مقدر تھیں اور جو مصائب مقدر ہو چکے ہوں انھیں ان کے واقع ہو جانے پر، صبر و تسلیم کے جذبات کے ساتھ جھیل لے جانا ضروری ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنا رب ماننے کا یہی معیار ہے، اسی کا نام تسلیم و رضا ہے اور یہی کمالِ ایمان کا مقتضا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اسی چیز کا مطالبہ کیا ہے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (مومن — ۶)

پس (مصائب پر) صبر کرو (اور یقین رکھو کہ) خدا کا وعدہ سچا ہے۔ اور اپنے گناہ کی معافی مانگو۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (آل عمران — ۹۳)

اور اگر تم صبر سے کام لوگے اور خدا سے ڈرتے رہوگے تو ان (اعدا دین) کی چالیں تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔

اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ (یوسف — ۱۰)

اس میں شک نہیں کہ جو خدا سے ڈرتا ہے اور صبر پر کاربند رہتا ہے (اس کے لیے کامیابی ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

غرض نزولِ مصائب کے وقت ایک مومن کا فرض یہی ہے کہ وہ صبر اور تسلیم کا شیوہ اختیار کرے۔ اسی کا نام ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا ہے۔ اس کے مقابل معاصی کے بارے میں اس کا فرض یہ ہے کہ ان پر صبر کرنے اور خوشی کے ساتھ کرتے رہنے کے بجائے ان سے پوری نفرت کے ساتھ دور بھاگے، ان کے سامنے سپر انداز ہونے کے بجائے ان سے برسرِ پیکار رہے، اگر کبھی دامن ان سے آلودہ ہو جائے تو خدا کے سامنے توبہ و استغفار کے آنسوؤں سے اسے پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے کو نہیں بلکہ دوسروں کو، خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا پائے تو اس وقت اس کا فرض یہ ہے کہ اپنی وسعت اور طاقت بھر انھیں ان سے روکنے کے لیے کمربستہ ہو جائے۔ جہاں کہیں بھی برائی نظر آئے، اسے مٹانے کی جد و جہد کرے اور اس کے پشت پناہوں — یعنی کفار اور منافقین — سے خدا کے لیے جنگ کرے۔ نیکی اور معروف کو محبت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک رہے۔ اللہ کے دوستوں کو دوست رکھے اور اس کے دشمنوں کو دشمن، اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اور اس موقع پر نسل و خاندان اور

قوم و وطن کے تمام رشتوں کو فراموش کر دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ . . . . . . قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ۔ (ممتحنہ ۔ ۱)

اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم ان کو محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ وہ اس حق کا کھلم کھلا انکار کر چکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے اور رسول کو، نیز تم سب کو، تمہارے اپنے گھر بار سے نکال دیتے ہیں . . . . . . تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے رفقاء کے (سوانح حیات) میں ایک عمدہ نمونۂ عمل موجود ہے۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سے اور تمہارے معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، ہم بری اور بے تعلق ہیں، ہم تمہارا (یعنی تمہارے مسلک کا) انکار کرتے ہیں۔ ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض پیدا ہو چکا ہے یہاں تک کہ تم تنہا اللہ ہی پر ایمان لاؤ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ ۔ (مجادلہ ۔ ۳)

تم کسی قوم کو، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو، ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں سے رشتۂ مودت رکھتی ہو، جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں، خواہ وہ ان کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان والے کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان پیوست کر دیا ہے اور اپنی "روح" سے ان کی تائید اور مدد کر رکھی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کفر و نفاق کی معصیتوں میں گرفتار رہنے والوں کے لیے قضا و قدر کا عذر واقعی کوئی عذر ہوتا تو پھر ان سے اتنی شدید نفرت اور عداوت رکھنے کا حکم کیوں ہوتا۔ اور اگر ایمان بالقدر کا مطلب یہ ہوتا کہ جو برائیاں بھی عالم ظہور میں آتی ہیں، وہ مشیت الٰہی کے بموجب بہرحال ظہور پذیر ہونے والی ہیں، اس لیے ان کی مدافعت اور مقاومت کے بجائے ان کا خیر مقدم ہی کرنا چاہیے تو پھر اہل ایمان اور اہل کفر، اہل تقویٰ اور اہل فجور سب کو یکساں ہونا چاہیے تھا، حالانکہ قرآن حکیم کہتا ہے کہ:

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ۔

کیا ہم ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا رکھنے والوں کے برابر کر دیں گے یا متقیوں کو بدکاروں کے مساوی کر دیں گے؟

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۔

تو کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں اور نافرمانوں کی طرح کر دیں گے؟

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً

کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہ برائیاں کمائی ہیں، یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم انہیں ان کے برابر کر دیں گے جو صاحب ایمان ہیں اور

مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں ؟ ان کا مرنا اور جینا دونوں یکساں ہیں ؟

اس طرح کی ایک دو نہیں بلکہ بے شمار آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہل حق اور اہل باطل، اہل طاعت اور اہل معصیت، اہل ہدایت اور اہل ضلالت، اہل تقویٰ اور اہل فجور کے درمیان انتہائی تفریق کی اور ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا ہے۔ لیکن جس شخص کی نگاہ صرف حقائق تکوینی ہی تک پہنچتی ہے اور حقائق تشریعی کی معرفت تک اس کی رسائی نہیں ہوتی، وہ ان دونوں متقابل گروہوں اور ان کی متضاد صفتوں کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا اور دونوں کو ایک ہی صفت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ قرار دے دیتا ہے، جیسا کہ قیامت کے دن ایسے لوگ خود ہی اپنی اس نادانی کا حیرت کے ساتھ اظہار کریں گے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (شعراء — ۵) قسم اللہ کی یقیناً ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جبکہ ہم تمھیں (تم بتوں کو) پروردگار کائنات کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔

یہی نہیں، بلکہ اس جاہلانہ منطق نے بہتوں کو جہل و ضلالت کی اس آخری سرحد پر پہنچا دیا ہے جس کے بعد گمراہی کی کوئی منزل باقی نہیں رہ جاتی۔ ان لوگوں نے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کو خالق کائنات کا مساوی ٹھیرا دیا اور ہر موجود کو اس طاعت اور عبادت کا مستحق بنا دیا جو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا حق تھا۔ اور یہ اس طرح پر کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہی ساری موجودات کا وجود ہے یعنی وجودِ کائنات اور ذاتِ الٰہی دونوں ایک ہی حقیقت کے مظہر ہیں اور ہم جسے اللہ کہتے ہیں وہ مخلوقات کے وجود سے الگ اور ماسوا کوئی چیز نہیں۔ العیاذ باللہ۔ اس کے بعد کفر اور الحاد کا اور کونسا مقام باقی رہ جاتا ہے!

گویا اس خالص کافرانہ نظریہ کے قائلین منطقی طور پر، اُن دونوں معنوں میں سے کسی معنی میں بھی اپنی عبودیت کا اعتراف نہیں کرتے جن کی توضیح اور تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر تو وہ خود اپنے ہی کو خدا کہتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ بہت سے ملحدین نے صراحۃً اس امر کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں عابد بھی ہیں اور ہمیں معبود بھی۔ حالانکہ یہ قول نہ تو حقائق دینی ہی کے اعتراف و مشاہدہ پر مبنی ہو سکتا ہے، نہ ہی حقائق تکوینی پر، بلکہ کھلا ہوا جہل اور اندھا پن ہے۔ نصاریٰ کو خدا نے کافر ٹھیرایا صرف اس بنا پر کہ وہ ایک انسان ——— حضرت مسیح علیہ السلام ——— کے متعلق حلول اور اتحاد کا عقیدہ رکھتے تھے، پھر ان لوگوں کے کفر صریح کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو کائنات کے ایک ایک ذرہ کے بارے میں یہی اعتقاد رکھتے ہیں۔

ان کے مقابل ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے پاس خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ ان کا علم اور یقین یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر شے کا رب، ہر چیز کا مالک اور ہر موجود کا خالق ہے۔ ایسا خالق جو تمام مخلوقات سے بالکل جداگانہ اور مبائن حقیقت رکھتا ہے۔ وہ نہ تو کسی شے میں حلول کرتا ہے، نہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے اور نہ اس کا وجود اور کائنات کا وجود ایک ہے ——— اس نے اپنی اور اپنے پیغمبروں کی کامل اطاعت کا حکم دیا اور ہر طرح کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ وہ فساد کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اپنے بندوں کو کفر و شرک کرتے دیکھ کر اس کے غضب کی انتہا نہیں رہتی۔ مخلوق کے لیے ضروری ہے کہ اس کی عبادت میں ہمہ دم مصروف رہے، اس کے احکام بجا لاتا رہے اور اس کے لیے اسی سے توفیق بھی مانگے۔ جیسا کہ قرآن مجید سکھاتا ہے کہ ہم کہیں کہ:-

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ (فاتحہ) (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے توفیق اور مدد مانگتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہیں سے منجملہ دیگر فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ خدا کے بندے اپنے مقدور بھر امر بالمعروف کریں، منکر کا سدباب کریں اور خدا کی راہ میں کفار اور منافقین سے جہاد کریں۔

پھر اس علم اور یقین کے بعد وہ عملی طور پر میدان میں اتر آتے ہیں اور اللہ کے دین کو سطح ارض پر رائج کرنے کے لیے اپنی ساری قوتیں، صلاحیتیں اور کوششیں صرف کر دیتے ہیں، اور اس راہ میں وہ اللہ ہی سے نصرت اور تائید بھی مانگتے ہیں، نہ کہ قضا و قدر کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ طلب اعانت اور توفیق طلبی ان مکروہات کے بیچ تثبیت قلب کا کام دیتی ہے جو انہیں اس راہ میں پیش آتے ہیں اور ان مکروہات کا مقابلہ کرنے کی توانائی بخشتی ہے جو آئندہ پیش آ سکتے ہیں۔ مثلاً انسان کھانا کھاتا ہے تاکہ وہ اس خوراک سے اپنی موجودہ بھوک کا ازالہ کرے اور آئندہ کے لیے اپنے جسم کو وہ قوت بہم پہنچائے جو مستقبل اغتہا کا دفاع اور مقابلہ کر سکے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتا کہ تقدیر کے نام پر کھانا پینا چھوڑ دے۔ یہی اصول ہے جو ہمیں اس حدیث سے ملتا ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا وہ دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں اور وہ تعویذ گنڈے جن سے ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور اسی طرح کی تمام احتیاطیں اور تدبیریں جن کو ہم اپنی روز مرہ کی زندگی میں برتتے ہیں تقدیر الٰہی کو بدل سکتی ہیں؟ آں حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ہِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ، یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی کے ماتحت ہوتی ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ " دعا اور بلا زمین اور آسمان کے درمیان دوچار ہوتی ہیں اور آپس میں گتھم گتھا ہو جایا کرتی ہیں"۔

یہ ہے اُن لوگوں کے علم و اعتقاد اور سعی و عمل کا حال جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی عبادت و بندگی کرتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں جن کا اوپر ذکر ہوا سب کی سب عبادت میں داخل ہیں۔

توافق للبقاء

مغرب کے نظریۂ ارتقاء پر ایک تعمیری تنقید

(از جناب نعیم صدیقی)

موجودہ یورپ کے مذہب "عقل پرستی" کی "الکتاب" کا ایک مشہور سورہ "جدید نظریۂ ارتقاء" ہے۔ یہ نظریہ ان بنیادی معتقدات یا اصول تہذیب میں شمار ہوتا ہے جو موجودہ سائنس کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تائید یا تردید بڑا نجیدہ معاملہ ہے۔

جدید نظریۂ ارتقاء نے تنازع للبقاء کے تخیل کو تمدن کی جڑوں میں پیوست کر دیا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان انفرادی طبقاتی اور قومی کشمکش نہ صرف یہ کہ لازمی ہو گئی ہے بلکہ حق اور نیکی کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور اس تصور کا عملی اثر یہ ہے کہ زندگی ایک خوفناک جہنم کی منزل پر پہنچی ہے۔ انسان اس جہنم سے نکلنے کے لیے سخت مضطرب ہے مگر جدید انسانی شریعتوں کے معمار یہ بتاتے ہیں کہ ہم اس جہنم سے کبھی نہیں نکل سکتے کیونکہ اس کی تشکیل و تکمیل ان فطری قوانین کے ماتحت ہو رہی ہے جن کے آگے سپر ڈال دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ انھیں فطری قوانین کو نظریۂ ارتقاء کے زیر عنوان جمع کیا گیا ہے۔

اب فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ ہمارے تہذیبی سفر کے جو اصول پیش کیے جا رہے ہیں آیا وہ کسی ایسی بدیہی تحقیق پر مبنی ہیں جس کی صداقت میں شبہ نہ کیا جا سکے یا یہ تحقیقات ابھی نامکمل ہے اور ابھی ارتقائے حیات کے اصولوں کی دریافت میں مزید ارتقاء کی گنجائش باقی ہے۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو پھر اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ "کافر تواں شد، ناچار مسلماں شو!" —— یعنی فطرت کے قہر و جبر کے آگے سر تسلیم خم کر کے اس کرہ کے اوپر ہم اپنے خون سے ہولی کھیلتے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم قدیم روما کے کسی خوفناک اکھاڑے میں اتار دیے گئے ہیں۔ لیکن اگر دوسری صورت معقول ہو تو پھر ہمیں اطمینان کا سانس لینا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ شاید کوئی راہ نجات نکل آئے۔ اس مضمون کا مدعا دراصل اسی امر کا تصفیہ کرنا ہے۔ ارتقائے حیات کے اصولوں کی نشان دہی میں مغربی مفکرین کے تدبر نے جو جو کوتاہیاں کی ہیں انھیں ہی نے مختصر الفاظ میں پیش کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مروجہ نظریۂ ارتقاء جسے ہم نے ایک تجربی صداقت کی حیثیت دے کر اپنے علوم کی روح بنا دیا ہے، درحقیقت ایک تجربی صداقت نہیں ہے۔

طبیعیاتی نظریہ یہ حقیقت کہ کائنات بہ حیثیت مجموعی اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ اپنی موجودہ شکل تک تدریج کے راستہ سے پہنچی ہے ایک ایسی حقیقت ہے جو سرسری مشاہدہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ باول نظر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کائنات چھلانگیں نہیں لگاتی بلکہ اپنے فطری راستہ پر ایک خاص رفتار سے رینگ رہی ہے۔ اس حقیقت کو علت و معلول اور سبب و مسبب کے پیچیدہ نظم سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں دانہ مٹی میں ملتا ہے، پھر اس پر زمینی قوتیں متواتر اپنا عمل کرتی ہیں، پھر زمین سے ایک کونپل سی ابھرتی ہے، پھر حرارت، ہوا،

روشنی اور پانی کے مجموعی عمل سے یہ تنا ور درخت بننے لگ جاتی ہے، پھر اس پر بور آتی ہے، پھر پھول لگتے ہیں، پھر پھول کی زیریں تھیلی میں حمل قرار پاتا ہے، پھر ننھا سا بیجدان پھول کر پھل بن جاتا ہے ۔ یہاں اگر بارش برستی ہے تو اس کے پیچھے اسباب و علل کا وسیع سلسلہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ سورج اپنی گرمی سے پانی کو بخارات میں بدلتا ہے، بخارات حرارت کی مدد سے کشش زمین کے خلاف حرکت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، پھر یہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر دور دراز علاقوں میں جا پہنچتے ہیں، پھر کسی ٹھنڈی فضا میں عمل تکاثف واقع ہوتا ہے اور ننھی ننھی بوندیاں ٹپکنے لگتی ہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ بارش ہو رہی ہے ۔

اس سلسلۂ اسباب و علل کو اگر اور قریب سے دیکھنا ہو تو انسان کی حیات جسمانی کا مطالعہ کیجیے۔ کس طرح قوت میں انحطاط آتا ہے تو بھوک لگتی ہے، پھر کس طرح غذا کو جزو بدن بنانے کے لیے ایک پوری مشین اپنی پیچیدہ فعلیت کو استعمال کرتی ہے، پھر کس طرح از سر نو قوت پیدا ہو کر اعمال کی تشکیل میں صرف ہونے لگتی ہے۔ جسم کے نشو و نما کو دیکھیے، اس کی صحت کے بگڑنے اور بحال ہونے کے اصولوں کا مطالعہ کیجیے اور اس پر بڑھاپے اور موت کے اثرات پر غور کیجیے تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہر تغیر اپنے پیچھے اسباب رکھتا ہے اور اسباب کا ظہور بالکل تدریج سے ہوتا ہے ۔

سلسلۂ اسباب و علل کے جاری رہنے کے لیے تدریج ناگزیر ہے۔ چنانچہ آپ کائنات کے ہر تخریبی اور تعمیری عمل میں تدریج کو کار فرما دیکھتے ہیں۔ وقت بالکل اسی طرح گزر رہا ہے جس طرح قدیم عہد کی آبی گھڑیوں میں پانی کی ایک ایک بوند ٹپکتی رہتی تھی حتیٰ کہ اوپر کے خانے کا پورا پانی نچلے خانے میں آ جاتا۔ لمحہ لمحہ کر کے ساعت بنتی ہے، ساعتیں گذرتی ہیں اور پہر بنتے ہیں۔ اسی طرح دن، ہفتے، مہینے، سال، قرن، صدیاں اور دور ایک خاص رفتار سے بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر یہاں تدریج کا قانون بر سر عمل نہ ہوتا اور فطرت جست لگاتی ہوتی تو کائنات کی پوری داستان دو چار لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ یعنی مادہ عدم سے ایک دم وجود کی انتہائی شکل میں منتقل ہو جاتا اور اسی طرح وجود سے عدم میں اس کا انتقال بھی آنی ہوتا۔ لیکن داستان وجود بہت طویل ہے۔ اتنی طویل کہ ہم اس کے آغاز کا دھندلا سا تصور ہی کر سکتے ہیں۔ یہ طویل حکایت تدریج سے پیدا ہوا ہے ۔

اب دوسرا مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی تدریجی حرکت ارتقائی ہے یا انحطاطی؟ سو اس سلسلہ میں محققین علوم طبیعیہ نے جتنا مواد فراہم کیا ہے وہ یہی شہادت دیتا ہے کہ بہ حیثیت مجموعی کارخانۂ وجود میں بناؤ کے آثار پائے جاتے ہیں اور موجودات کمال کی طرف گامزن ہیں۔ مذہب کی شہادت بھی یہی بتاتی ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا، پھر دنیا کی تعمیر شروع ہوئی اور اسی دنیا کا ایک حصہ کرۂ ارضی بھی تھا، پھر اس کرۂ ارضی میں زندگی نمودار ہوئی اور آخر کار زندگی کا کامل ترین نمونہ انسان عجائب گاہ وجود کی رونق بنا۔ جو لوگ خدا کو کارخانۂ فطرت کا موجد اور مدبر مانتے ہیں ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ اس کی قدرت کا آرٹ ایک خاص منزل پر رکا ہوا ہے یا وہ رو بانحطاط ہے۔ ایک حکیم ہستی پر ایسا الزام لگانا انسانی فطرت سے بہت بعید ہے۔ ہمیں قرآن خود بتاتا ہے کہ صرف زمینوں اور آسمانوں کے خاندان کی تخلیق "ستۃ ایام" میں ہوئی ہے۔ (یہاں "یوم" سے مراد دور ہے)۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد زندگی کا جو کھیل رچایا گیا ہے اس پر کتنے اطوار گذرے ہوں گے۔ یہ اطوار راہ تنزل کے سنگ ہائے میل تو نہیں ہو سکتے، یہ ارتقا ہی کے مرحلے ہیں ۔

بہر حال یہ حقیقت کہ کائنات منجمد نہیں بلکہ متحرک ہے اور اس کی حرکت انحطاطی نہیں بلکہ ارتقائی ہے، اسے یورپ کے

طبیعیین، ماہرین طبقات الارض اور علمائے حیاتیات نے ناقابلِ انکار پایا اور اسے اپنی فکری کاوشوں کے ماحاصلات میں داخل کرلیا۔ لیکن اس میدان میں ان کی خوفناک ذہنی لغزش یہ تھی کہ عیسائیت کی ناروا بندشوں اور اربابِ کلیسا کی حرکتوں نے ان میں خداپرستی کے خلاف ایک متعصبانہ جذبہ پیدا کردیا اور اسی باغیانہ انتہاپسندی کے ماتحت انھوں نے کائنات کے کارخانے کو بے خدا چلتا ہوا دکھانے کی کوشش کی۔ جوں جوں ان پر کائنات کی اس تدریجی حرکت کا انکشاف ہوتا گیا جو علت ومعلول کی شاہراہ پر اصولِ فطرت کی حدود کے متعلق جاری ہے، وہ خدا کی نفی پر مائل ہوتے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بارش برسانے کے لیے، دانہ اُگانے کے لیے، زندگی کو نمو عطا کرنے کے لیے کائنات کی قوتیں بالکل کافی ہیں اور ہر مسبّب کو اس کا طبعی سبب کسی فوق الطبیعی خارجی قوت کی مداخلت کے بغیر نمود دے رہا ہے۔ ان کے طبیعی فلسفہ کا فتویٰ یہ تھا کہ مادّہ اور قوت کا باہمی تعامل صرف وہی شکل اختیار کرتا ہے جو صحیح اور موزوں ہوتی ہے۔ یہی کائنات کی قانونیت کا راز ہے۔

آنکھیں رکھنے والا اگر نہ دیکھنا چاہے تو اسے سورج بھی دکھائی نہ دے گا۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا۔ ورنہ کائنات میں قانونیت کا ہونا، قوت اور مادہ کی مشین کے پیچھے ایک ہمہ گیر شعور وارادہ کی کارفرمائی کو لازمی کردیتا ہے۔ پھر ارتقائی حرکت تو شعوریت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ تو ایک ایسا ذہن چاہتی ہے جو ارتقائی اور انحطاطی حرکت میں تمیز کرسکے اور جو ترقی کی منزلِ مطلوب اپنے سامنے رکھتا ہو۔ یہ منصب مادہ اور قوت دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں۔ ایک مشین جسے وجود میں لانے کے لیے مادی سامان (Material) کی اور جسے حرکت میں لانے کے لیے قوت (Energy) کی ضرورت ہے، اپنی ترتیب اور اپنی منظم حرکت کی نتیجہ خیزی کے لیے لامحالہ ایک شعور کی محتاج بھی ہے۔ پہلی دو ضرورتوں کو تو مغربی سائنس نے تسلیم کیا لیکن تیسری ضرورت سے بہت بری طرح چشم پوشی کرلی۔ یہ غلطی طبیعیات کے میدان میں ایک معمولی سی لغزش نظر آتی ہے مگر چونکہ اس کا دائرۂ اثر انسان کی تہذیبی زندگی کو محیط ہوتا ہے اس لیے پھر اس سے غلطیوں کی ایک نسل چل نکلتی ہے۔

حیاتی نظریہ

مدتوں پہلے عرب مفکرین نباتات اور پرندوں کے مطالعہ سے یہ راز منکشف کرچکے تھے کہ نباتی اور حیوانی زندگی میں ارتقاء کارفرما ہے۔ لیکن اس انکشاف کو ذرائع کی کمی کی وجہ سے وہ ایک مکمل علم کی حد تک نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس عظیم الشان کارنامہ کا سہرا ڈارون کے سر بندھا۔ اس نے نباتات، کیڑوں مکوڑوں، دریائی جانوروں، تتلیوں اور دوسرے پرندوں کے مطالعہ ومشاہدہ سے حیوانی ارتقاء کے تصور کو مکمل کیا۔ اور ان عوامل کی نشان دہی کی ایک ابتدائی کوشش کی جن کے ماتحت یہ ارتقاء واقع ہورہا ہے۔ جہاں تک نفسِ ارتقاء کے دعوی کا تعلق ہے، ڈارون سے اختلاف کرنا مشکل ہے، لیکن اس نے اپنے نظریہ کی جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ پوری کی پوری قابلِ قبول نہیں ہیں۔

اولاً وہ نباتاتی زندگی کی طرح حیوانی زندگی کے ایک ہی نقطۂ آغاز "امیبا" کا قائل ہے۔ اسی خیال کی تشریح اس نے "اصل الانواع" میں کی ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ علم الحیات کا خاکہ تو بنا ہے مشاہدہ سے مگر اس کو مکمل کرنے کے لیے رنگ آمیزی کی گئی ہے قیاس سے۔ مشاہدہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ تو ناقابلِ انکار ہے مگر قیاس کی ستم ظریفیاں چون وچرا کی کافی گنجائش اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ دعویٰ محض قیاسی ہے کہ زندگی نے واحد نقطۂ آغاز سے حرکت شروع کی تھی۔ آخر یہ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کی اولین نمود کے لیے کرۂ ارضی پر صرف ایک ہی مقام پر حالات سازگار ہوئے تھے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اسے مختلف مقامات سے شروع ہونا چاہیے۔ اس صورت میں اس کے ابتدائی ظہور کی شکل کو ہر ماحول میں ایک ہی ماننا مشکل ہوجاتا ہے۔ خود ڈارون اور اس کے متبعین اختلافِ ماحول کو حیاتی وعضویاتی اختلافات

کا ایک نہایت قوی سبب مانتے ہیں۔ پھر اگر مختلف حالات اور مقامات سے مختلف پیرایوں میں زندگی کے ظہور کو مان لیا جائے، تو "اصل الانواع" کا سارا فلسفہ باطل ہو جاتا ہے۔

پھر حیات کی حرکت کو جاری رکھنے والے معروف اصول بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کی جو تشریح پیش کی گئی ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی اپنی ادنیٰ اشکال کو کچلتی اور روندتی ہوئی کسی اعلیٰ شکل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس موقع پر وہ مشہور سوال پیدا ہوتا ہے جسے حامیانِ ارتقاء اب تک حل نہیں کر سکے ہیں کہ زندگی کی بعض بالکل ابتدائی اشکال آج تک کیوں کرۂ ارضی پر باقی ہیں، مثلاً مچھلیاں، مینڈک وغیرہ حتیٰ کہ زندگی کا پہلا ڈیزائن یعنی "امیبا" بھی نہیں مٹ سکا۔ زندگی نے جب انسان جیسا اعلیٰ مظہر فراہم کر لیا ہے تو اس کے ساتھ یہ ادنیٰ حیوانات کیوں جیے جا رہے ہیں؟ اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو ادنیٰ حیوانات ابھی تک جیے جا رہے ہیں انھوں نے ماحول کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہے۔ مگر اس پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو حیوانات دنیا سے ناپید ہو گئے ہیں وہ کیوں نہ ماحول سے موافقت پیدا کر سکے؟ آخر ماحول سے موافقت پیدا کرنے یا نہ کرنے کی ذمہ داری براہ راست وجود پر تو ہے نہیں، اس کا انحصار تو بہر حال فطرت پر ہے، تو براہ کرم یہ بتائیے کہ کونسا قانون تھا جس کے ماتحت مینڈک سلامت رہا اور سیمرغ ناپید ہو گیا؟ اس کی جسامت کن اسباب کے ماتحت کم نہ ہو سکی؟ اس کا معدہ کن اصولوں کے زیر اثر سکڑ نہ سکا؟ وہ دشمن سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بہتر اعضا کیوں فراہم نہ کر سکا؟

اور آگے چلیے، حیات کا ارتقائی عمل جن اصولوں پر واقع ہوتا ہے وہ جوں کے توں ہیں اور حیات کی بالکل ابتدائی اشکال بھی موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ ارتقاء کی راہ پر ایک ہی قافلہ انسانیت کی منزل تک پہنچ کر رہ گیا، اس کے بعد کوئی دوسرا قافلہ آگے نہ بڑھا؟ حالانکہ قانون ارتقاء کی رو سے تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے قافلہ کے بعد بے شمار قافلے حیوانیت کی سرحد سے انسانیت کے حدود میں پے در پے داخل ہوتے چلے جاتے اور شاہ راہ ارتقاء کی ہر منزل پر ہم ایک نہ ایک قافلے کو بالفعل موجود پاتے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اول تو بیچ کی منزلوں پر بکثرت کڑیاں غائب ہیں جن کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی، دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے پانچ ہزار برس کے دوران میں جس کا تاریخی و اثری ریکارڈ محفوظ ہے، انسان صرف انسانی نطفے ہی سے پیدا ہوتے رہے ہیں، نچلے طبقاتی حیوانوں میں سے کوئی بھرتی نوع انسانی کو نہیں ملی۔

یہ ایک نہایت قوی اعتراض ہے جس کا کوئی معقول جواب ڈارونی نظریہ کے پیرو نہیں دے سکے ہیں۔ بسا اوقات وہ کہتے ہیں کہ ارتقاء کی راہ پر یکے بعد دیگرے قافلے چلے آ رہے ہیں، یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے، اور اس کے ثبوت میں "بن مانس" پیش کیے جاتے ہیں کہ یہ ہمارے پیچھے ایک قریب ترین قافلہ ہے جو منزل سے نزدیک آ پہنچا ہے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر "گمشدہ کڑیوں" کا مطلب کیا قرار پائے گا؟ عقیدۂ ارتقاء کا کوئی علمبردار بھی اس بات کا مدعی نہیں ہے کہ زندگی کی تمام اشکال ا سے ی تک موجود ہیں۔ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ سلسلۂ وجود کی بعض کڑیاں ناپید ہیں اور اس سے ان کے نظریہ پر جو نقص وارد ہوتا ہے اسے دفع کرنے کے لیے وہ فرض کر لیتے ہیں کہ حیات کی فلاں فلاں قسم کی فلاں فلاں صفات رکھنے والی بعض اشکال "تنازع للبقاء" کے معرکے میں شہید ہو گئی ہیں، یعنی اگرچہ وہ آج موجود نہیں ہیں، مگر وہ کبھی نہ کبھی تھیں ضرور۔[1] ان کے اس بیان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم انسان ارتقاء کی جو راہ طے کر کے موجودہ منزل تک پہنچے ہیں اس

---

[1] ان کے اس قول کو ہم "مفروضہ" سے اس لیے تعبیر کرتے ہیں کہ انھوں نے آج تک اس بات کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ جن کڑیوں کو (باقی)

میں جا بجا بڑے بڑے غار پڑ گئے ہیں اور گمشدہ کڑیوں نے اس تسلسل کا خاتمہ کر دیا ہے جو حیات کے ارتقائی سفر میں ہونا چاہیے تھا۔ پھر کوئی قافلہ اس تباہ شدہ راستے پر کیسے بڑھ سکتا ہے؟

اب اگر مزید قافلوں کی روا روی مسدود ہے تو لازماً اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان تک پہنچنے کے بعد زندگی کی ارتقائی حرکت بند ہو چکی ہے۔ اور جب عمل ارتقاء جاری نہیں ہے تو تنازع للبقاء کے کیا معنی؟ اور بعض بہت ترقی یافتہ شکلوں کے مفقود ہو جانے کے بعد بعض دنی اشکالِ حیات کے باقی رہ جانے کی کیا وجہ؟

اوپر کی سطور سے غالباً یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ڈارون کا نظریہ مشاہدات اور قیاسات کا مخلوطہ ہے لہٰذا اس کی حیثیت ایک تجربی صداقت یا ایک ثابت شدہ حقیقت کی نہیں ہے۔ مگر اس کو جب فروغ حاصل ہوا تو علمائے یورپ نے اسے ایک امر واقعی کی طرح ناقابلِ تردید مان کر اس کی بنیاد پر علوم کی تدوین شروع کر دی۔ پھر ان علوم پر نظامِ زندگی کی جو عمارت کھڑی کی گئی وہ انسانیت کی آسائش گاہ بننے کے بجائے آدم کشی کے لیے ایک اچھا مقتل ثابت ہوئی۔

جس طرح علمائے طبیعیات نے خدا کے انکار کو فکر کا نقطۂ آغاز بنایا اسی طرح ڈارون اور اس کے متبعین نے حیاتیات کے کلیسا کو خدا سے خالی کر کے فلسفۂ حیات کی تعمیر شروع کی، حالانکہ اس غلط طرزِ فکر سے بعض ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جن کا سلجھانا کارے دارد ہے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ طبیعی عناصر کے اندر مقامِ شعور کی طرف بڑھنے کا رجحان کہاں سے آیا اور اس کے لیے ایک ایسی شاہراہ کے مراحل کس نے تجویز کیے جو طے کیے جانے سے پہلے موجود نہیں تھی؟ "اصلحیت" کا معیار کس کے پاس تھا جو اعلیٰ کو ادنیٰ سے چھانٹتا جا رہا تھا؟ ایک حیوان نئے ماحول کے تقاضوں سے جب دوچار ہوتا تھا تو کون تھا جو اس میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس کرتا تھا اور کون تھا جو اس ضرورت کو پورا کرتا تھا؟ اور کس نے ارتقاء کے لیے "تنازع للبقاء" کا قانون بنایا جس پر جانداروں کی نسلوں کی نسلیں بھینٹ چڑھ گئیں؟ ——"کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔ مگر اس معشوق کا انکار کر کے یورپ کی حکمت اس پردۂ زنگاری ہی کو معشوق بنا بیٹھی۔

اس نظریہ کا نمایاں ترین اثر انسانی ذہنیت پر یہ پڑا کہ انسان کو انسان سمجھ کر غور کرنے کے بجائے اسے حیوان فرض کر کے مختلف سیاسی، معاشی اور اخلاقی سوال حل کرنے شروع کر دیے گئے۔ جہاں کوئی پیچیدگی تمدن میں پیدا ہوئی ماہرینِ فنون نے پلٹ کر انسان کے نودریافت شدہ "اسلاف" کی زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا اور جو اصول حیوانی زندگی میں کارفرما دیکھے انہیں جوں کا توں لا کر انسانی زندگی پر چسپاں کر دیا۔ اس طرح ہوتے ہوتے "تہذیبی ارتقاء" کا ایک عظیم الشان فلسفہ مدون ہوا جس کے اصول نئی انسانی دنیا کے اساسی معتقدات میں شمار ہوتے ہیں اور جن کے اثبات میں انتہائی تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔

تہذیبی نظریہ اور اس کا ارتقاء | یورپ میں جاگیرداری نظام کی جانشینی کے لیے جس دن مشینی دور نے جنم لیا تھا، شاید دنیا کے لیے اس سے بڑا منحوس دن کوئی نہ آیا ہو گا۔ اسی دور میں سائنس نے انسان کو نو بنو قوتیں مسخر کر دیں اور مشین نام کے آہنی دیو کو تہذیبِ انسانی کے قصرِ زریں میں تختِ استبداد پر بٹھا دیا۔ مشین جو خدا کا ایک عظیم الشان انعام تھی، اس کی سرعتِ عمل اور کثرتِ

(بقیہ) وہ مفقود قرار دیتے ہیں وہ فی الواقع کبھی پائی جاتی تھیں، بلکہ دراصل اپنے نظریہ کو سائنٹفک حیثیت سے قائم کرنے کے لیے انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ یہ کڑیاں کبھی ضرور پائی جاتی ہوں گی۔

کارگذاری مذہب کے غلط نظام کی وجہ سے انسانی تمدن کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گئی۔ اس کا پہلا حملہ دستی صناع پر ہوا کیونکہ مشین سے کام لینے کے لیے سرمایہ درکار تھا اور اُس سے کاریگر محروم تھا۔ وہ بچارا "عقل کا پورا" "گرگانٹھ کا کورا" تھا۔ مشین صرف سرمایہ دار کے حبالۂ عقد میں آسکتی تھی۔ چنانچہ اونچے طبقے کے لوگوں نے کارخانے کھول لیے اور صناع ان کے پاس مزدور بن کر کام کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ان کی مجبوری کی وجہ یہ تھی کہ مشینی مصنوعات پر وقت اور انسانی قوت کا صرفہ بمقابلہ دستی مصنوعات کے بہت ہی کم آتا تھا اور اسی وجہ سے ان کی قیمتیں بہت کم ہوتی تھیں۔ جوں جوں مشینیں بڑھتی گئیں صناع طبقہ کارخانوں میں جمع ہوتا گیا۔ ان کی مجبوری سے فائدہ یوں اٹھایا گیا کہ مشینی کثیر پیداوری سے جو غیر معمولی منفعت ہوتی تھی وہ تو سرمایہ دار کی تجوری کا پیٹ بھرنے کے لیے وقف ہوگئی اور کارکنوں کو صرف اتنا معاوضہ دینا کافی سمجھا گیا جس کے بل پر وہ کسی طرح جیے جائیں اور صنعت کے "کولھو" کو چلاتے رہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کے معاوضے بہت قلیل رکھے گئے بلکہ ان کے اوقاتِ کارکردگی کو بڑھانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ "نوبت بایں جارسید" کہ ایک خاندان کے پورے افراد کمانے پر مجبور ہوگئے۔ حتیٰ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے نکلنا پڑا اور نابالغ بچوں کو بھی کارخانہ داروں کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ پیٹ پالنا ہی کیا کم مشکل تھا کہ کارخانوں کی کیمیاوی فضا اور کثرتِ کار اور عالمِ طفلی کی محنت نے مل جل کر مزدور طبقہ کی صحتوں کو انتہائی طور پر گرا دیا۔ ہوتے ہوتے سوسائٹی مستقلاً معاشی نقطۂ نظر سے ظالم و مظلوم دو طبقوں میں بٹ گئی۔

سوال یہ ہے کہ یہ حالت پیدا کیسے ہوگئی تھی؟ کیوں نہ طبقہ وارانہ مظالم کی بروقت روک تھام کی گئی؟ اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ مشینی دور جمہوریت کو بھی ساتھ لایا تھا جس نے سرمایہ دار طبقہ کو حکومت کی مشینری پر پورا قبضہ دے دیا تھا اور یہ قبضہ کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ لٹیرے خود ہی حاکم بھی تھے اور لٹنے والے انھی کے آگے فریاد کرنے پر مجبور رہتے۔ یہ فرماں روا جو قانون بناتے تھے اس کا مقصد لوٹ کھسوٹ میں مزید سہولتیں پیدا کرنا اور کمزوروں کا خون چوسنے کے حق کی حفاظت کرنا تھا۔ انھیں لٹنے والوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ہمدردی اور انسانی ذمہ داریوں کے احساس کا ایک محرک مذہب ہوسکتا تھا، سوا سے پادری پہلے ہی دریابرد کرچکے تھے اور اس کے رہے سہے اقتدار کو جدید سائنٹفک تحریک نے بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے لیے جس انفرادی آزادی کا صور اٹھارویں صدی میں پھونکا گیا تھا اس نے ہر فرد کو کھلا لائسنس دے دیا تھا کہ اپنی قابلیت، ہوشیاری اور ذرائع و وسائل سے جس طرح چاہے اپنے مفاد کو ترقی دے اور اپنے حوصلے اور اپنی خواہشات پوری کرے قطع نظر اس سے کہ سوسائٹی پر اس کی خود غرضی کا کیا اثر مترتب ہو۔ معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق، غرض ہر شعبۂ زندگی میں اس آزادی کو فرد کا بنیادی حق قرار دے دیا گیا اور تمام قوانین اس اصول پر بنائے گئے کہ افراد کے اس "حق" کی لازماً حفاظت کی جائے۔

مشین اور سرمایہ داری کے اس گٹھ بندھن کا نتیجہ صرف یہی نہ نکلا کہ مغربی ممالک میں سے ہر ملک کا مال دار طبقہ خود اپنے ملک کے غریب طبقوں کے لیے خون آشام بن گیا، بلکہ مزید براں اسی چیز نے جدید امپیریلزم کو بھی جنم دیا۔ مشین کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کم آدمیوں کی محنت سے بہت مال پیدا کرتی ہے اور ملک کے کثیر التعداد باشندوں کو بے کار کر دیتی ہے۔ اب اگر ایک ملک جو مشینی صنعت کا طریقہ اختیار کرچکا ہو، اپنے تمام باشندوں کو برسرِ کار رکھے تو وہ اتنا زیادہ مال بنائے گا جو کسی طرح خود اس ملک میں نہیں کھپ سکتا۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیاں پیدا کرے اور اس کے ساتھ اس امر کی کوشش

بھی کرے کہ نہ تو خود اُن ملکوں میں مشینی صنعت کا طریقہ رائج ہونے پائے اور نہ وہاں کسی دوسرے ملک کا مال کھپ سکے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف پوری دنیا ظالم ملکوں اور مظلوم ملکوں میں تقسیم ہوگئی اور دوسری طرف خود ظالم ملکوں میں بھی دائمی رقابت اور جنگ کی بنا پڑ گئی۔

مگر اس کشمکش اور اس معاشی لوٹ کا فائدہ جو کچھ بھی ہوا ظالم ملکوں کے محض سرمایہ دار طبقوں ہی کو ہوا، نادار طبقوں کے لیے اس میں کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ ان کی ناداری اور بڑھتی چلی گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا اقتضاء یہی ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جائے۔ اس عمل کا سلسلہ جب ایک عرصہ تک جاری رہا تو طبقاتی ناہمواری ناقابلِ برداشت سی ہوگئی۔ اب عیاشی اور فاقہ کشی کا بڑھتا ہوا فرق کھٹکنے لگا۔ اسی دوران میں اعداد و شمار سے نتائج اخذ کرنے کا فن پھیل رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے طبقہ وارانہ شرحِ اموات اور شرحِ بیماری کو نمایاں کیا، جرائم کی تحقیقات کرنے والی کمیٹیوں نے عدالتوں کے ریکارڈ سے جرائم کی رفتار اور اس کے معاشی محرکات کو اجاگر کیا، آخر کار علماء کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ یہ خلافِ انسانیت حالات کیوں پیدا ہوئے ہیں۔

لیکن مسئلہ جتنا افسوس ناک تھا اس سے زیادہ افسوس ناک وہ حل نکلا جو مغربی ذہن نے تلاش کیا۔ سیدھی صاف بات تھی کہ دنیا اور اس کی متاعات کو لاوارث مال سمجھنے اور معیشت کو انفرادی معاملہ قرار دے کر آدمی کو کمانے اور کھانے میں بے لگام بنا دینے کا لازمہ یہ تھا کہ انسان انتہا درجہ کی خودغرضی سے کام لے اور اپنی زندگی کو ایک طبعی حادثہ سمجھتے ہوئے کسی اونچے مقصد سے بے نیاز ہو کر زیادہ سے زیادہ لذت و لطف حاصل کرنے میں لگ جائے، خواہ اس لطف و لذت کی قیمت میں اسے اپنے ابنائے نوع کا خون ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ جب خداناشناسی نے اسے اخلاقی ہستی سے گرا کر محض ایک معاشی جانور بنا دیا تھا تو پھر وہ اپنے پیٹ اور اپنے جذبۂ جنسی کے مقابلہ میں ابنائے نوع کا کیا پاس کر سکتا تھا۔ مگر اس سیدھی بات کو علمائے مغرب نہ پا سکے۔

عضویاتی زندگی نظریۂ ارتقاء کی لپیٹ میں پہلے ہی آ چکی تھی۔ اس کے ساتھ تمام مسائلِ زندگی کو ایک ہی اصول سے حل کرنے کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ پس علمائے عمرانیات نے اپنے عقلی تمدن کے حق میں پوری فریفتگی کے ساتھ یہ فتویٰ دے دیا کہ سوسائٹی بھی انھیں فطری اصولوں پر ارتقا کر رہی ہے جو عضویاتی زندگی میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں بھی تنازع للبقاء کا قانون اسی طرح برسرِ عمل ہے جیسے بے جان مادہ سے لے کر حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی زندگی ناقص اور کمزور افراد، طبقات اور اقوام کو پیچھے پھینکتی اور قوی و اصلح افراد، طبقات اور اقوام کو آگے بڑھاتی جا رہی ہے اور یہی ارتقاء کی شاہراہ ہے۔

خداناشناسی کے فطری نتیجہ کے طور پر جو "غیر فطری" حالت پیدا ہوگئی تھی اسے ان لوگوں نے فطری قرار دے کر اتنا بڑا ظلم کیا کہ اس پر انسانیت صدیوں تک ماتم کرتی رہے گی۔ عمرانیات جدیدہ نے سرمایہ دار طبقہ اور امپیریلسٹ اقوام کو تو اصلحیت کی سند دے کر مزید ستم ڈھانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور مزدور طبقہ اور محکوم اقوام کو یہ سبق پڑھایا کہ یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو گئے ہو بالکل فطری ہے۔ تم اگر پسے رہے ہو تو تمھارا حق یہی تھا کہ پسو۔ انسان اپنے ابنائے نوع سے مستقلاً برسرِ جنگ رہنے پر مجبور ہے اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ یا وہ ظالم طبقہ میں شامل ہو یا مظلوم گروہ میں۔ ان دو حالتوں کے سوا کوئی تیسری فطری حالت ممکن ہی نہیں ہے۔ فرد بہر حال افراد سے، خاندان خاندانوں سے، پارٹی پارٹیوں سے اور قوم قوموں سے اضطراراً متصادم ہے اور اس تصادم میں کمزور کا مٹ جانا ہی ارتقائے حیات کا مقتضا ہے۔ اندھی مشیت کی یہ جبریت اٹل ہے اور اس کا مقابلہ ناممکن!

یہ تخیل ایسا تھا کہ اس نے میدان میں آتے ہی تھوڑی دیر کے لیے تو ان تمام لوگوں کی زبانیں بند کر دیں جو تمدن جدید کی ناہمواریوں پر برہم ہو رہے تھے۔ یہ جو احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ ہم نے زندگی کے نظام کی ترتیب و تنصیب میں کوئی غلطی کر دی ہے ایک قلیل عرصے میں خودکشی کر گیا۔ طبقاتی اور قومی امپیریلزم نے اس نظریہ کا سب سے پہلے خیر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کی معاشی و سیاسی جلادی کو فطری نیکی قرار دے رہا تھا۔

اگلا قدم | یہاں تک کی علمی کاوشوں نے محکوم اقوام اور مزدور طبقہ دونوں کو فطرت کی جبریت کے پنجہ میں بے بس چھوڑ دیا تھا، لیکن بعد کے علماء نے ایک قدم آگے بڑھا کر مزدور طبقہ کو ایک نئی راہ نجات دکھائی اور وہ یہ تھی کہ تم قوت پیدا کر کے "بقائے اصلح" کے قانون کا تقاضا پورا کر دو تو اس آسمان کے نیچے تمہیں بھی کبریائی کا منصب مل سکتا ہے۔ سوسائٹی خاندان نہیں ہے کہ اس کے افراد آپس میں تعاون کے ساتھ جئیں بلکہ یہ پیدائشی دشمنوں کا ایک مجمع ہے جس کے اجزائے ترکیبی کے لیے قانونِ فطرت یہی ہے کہ ہر ایک دوسروں کو بھون کر کھانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہاں شریف بن کر رہو گے تو گھاٹے میں رہو گے اور اگر شرافتِ انسانی کی قبا اتار کر نزاع و مقابلہ میں مشغول ہو جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تاریخ کا جدلی فلسفہ مرتب ہوا۔ جدل و پیکار ارتقا کی شاہ راہ ٹھیری اور ہر بڑی خوں ریزی زندگی کے رہوار کے لیے ایک تازیانہ قرار پائی۔

اب نئے فلسفۂ اخلاق نے یہ اپدیش دینا شروع کیا کہ لذت اندوزی سب سے بڑی نیکی ہے اور سوسائٹی کی خاطر اپنی خواہشات پر کوئی روک لگانا ایک ایسا گناہ ہے جس کی تلافی کبھی ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ زندگی اسی کرہ پر ختم ہو جانے والی ہے۔ سیاست کا مذہب یہ قرار پایا کہ حکومت پر جو گروہ قابض ہو جائے وہ اپنی اصلحیت کی وجہ سے بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ قانون کے رولر سے انسانوں کو کچلتا پھرے۔ نیم مہذب اور نئے اسلحہ سے محروم اقوام پر ترقی یافتہ اقوام کا اپنی خدائی مسلط کرنا ان کا فطری حق ہے۔ معاشیات کے فلسفہ کی پکار یہ تھی کہ دنیا ایک ایسا خوانِ نعمت ہے جو محض خوش اتفاقی سے انسان کے ہاتھ آگیا ہے۔ اس کی نعمتوں سے حصہ وافر پانے کے لیے جہاں تک ممکن ہو دست درازی سے کام لیا جائے۔ کسی کا حصہ مقرر نہیں ہے اور کسی کے لیے حصہ کی تحدید نہیں ہے۔ اس دسترخوان کے استعمال کا کوئی اخلاقی ضابطہ نہیں ہے۔ مزے سے اپنے سامنے کی کشتی سے بھی تر مال اڑاؤ اور ہو سکے تو دوسروں کی رکابیوں کو بھی خپٹ کر جاؤ بلکہ اگر کسی کے منہ سے نوالہ چھین لو تو یہ بہت بڑی اصلحیت ہے اور اگر پیٹ میں نقب لگا کر معدہ سے غذا نکال لاؤ تو پھر تو کمال صلاحیت کے کہنے ہی کیا ہیں اور اگر بنا بنایا خون چوس سکو تو انسانیت تمہاری "ذو فطنی" پر ترنوں فخر کرتی رہے گی۔

یہ نظریات تھے جنھوں نے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو جہنم زار بنا دیا اور جدلی فلسفۂ تاریخ کے ماتحت اسی نظام کے پیٹ سے وہ نظام برآمد ہوا جسے آج کمیونزم کے نام سے ہر تعلیم یافتہ شخص پہچانتا ہے اور جس نے سرمایہ داری کی قہرمانیوں کا جواب مزدوری کی خونی ڈکٹیٹرشپ سے دے کر نظریۂ ارتقاء کے صداقت نامہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

مختصر یہ کہ اس سماجی نظریۂ ارتقاء نے حسب ذیل اصول پیش کیے ہیں:۔

(۱) جو قانونِ ارتقاء بے جان مادّے کی حرکت میں پایا جاتا ہے اور جو عالم حیوانات میں اور خود انسان کی عضویاتی زندگی میں جاری ہے وہی تہذیب و تمدن کی حرکت میں بھی کارفرما ہے۔

(۲) تہذیبی ارتقاء غیر منقطع تسلسل کے ساتھ اور انسان کی شعوری خواہش کے بغیر ہو رہا ہے۔

(۳) اس ارتقا کی شاہ راہ "تنازع للبقاء" ہے جو نہ صرف انسان اور طبیعی قوانین کے درمیان جاری ہے بلکہ خود نوع انسانی کے اندر قوموں اور افراد کے اندر بھی جاری ہے۔

(۴) تنازع للبقاء کا قطری اصول ہم پر بہ جبر نافذ ہے اور ہم اسے تسلیم کرنے کے کوئی چارہ نہیں رکھتے۔

آیئے اب ذرا ان اصولوں کو پرکھ لیں۔

کیا تہذیب اِرتقا کر رہی ہے

تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عضویاتی زندگی میں فی الواقع ڈاروینی تصور کے مطابق قانونِ ارتقاء کام کر رہا ہے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ انسان کی عضویاتی اور تہذیبی و اخلاقی زندگی میں ایک بہت بڑا فرق ہے جس کے ہوتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا اور دونوں پر ایک ہی قسم کے اصولوں کا علی الاطلاق تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ آپ اگر زہر کھا لیں اور پھر یہ چاہیں کہ آپ کا معدہ اس زہر کے کسی اثر کو آپ کے نظام جسمانی پر مترتب نہ ہونے دے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ آپ کے کان کھلے ہوئے ہوں اور کوئی خارجی آواز آپ کے دماغ پر اثر انداز بھی نہ ہو یا آپ کی آنکھ بند رہے اور آپ اپنے گرد و پیش کے موجودات اور ان کی حرکات کو دیکھتے جائیں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اگر آپ یہ چاہیں کہ آپ اپنی قوت کو صرف تو کرتے رہیں لیکن اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جسم بھوک کی شکل میں اپنا "بل" نہ پیش کرے اور آپ یہ بل دیدہ و دانستہ ادا نہ کریں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کتنی ٹھوس قانونیت ہے جس کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں خود زری کا داؤں نہیں چلتا۔ یہاں آپ فطرت کے مطالبات سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی زندگی کے ایک دوسرے میدان میں آپ کی حیثیت کچھ اور ہے۔ مثلاً آپ جاتے ہیں اور اپنے دوست کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرہ بالکل خالی پڑا ہے اور اتفاق سے میز پر آپ کے دوست کا پارکر پن پڑا ہوا ہے۔ اسے اگر آپ اٹھا کر الٹے پاؤں لوٹ جائیں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے اور اس فعل سے آپ پر کوئی برا اثر بظاہر مترتب نہیں ہوتا ہے۔ فرمایئے، اب آپ پورے اختیار کے مقام پر کھڑے ہوئے ہیں یا نہیں۔ ایک دوراہا آپ کے سامنے کھلا پڑا ہے اور انتخاب کا پورا حق آپ کو حاصل ہے۔ کوئی خارجی قوت آپ کو عمل کی کسی منفی یا مثبت شکل پر مجبور نہیں کرتی۔ یہاں فطرت کی غیر متغیر اور بے لچک قانونیت مفقود ہے۔ ان دو قسمی مثالوں سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف مجبوری کا مقام ہے جہاں صحیح اور غلط کا تصور تو ہے مگر نیکی اور بدی کا نہیں۔ دوسری طرف مختاری کا منصب ہے جہاں نیکی اور بدی کا تصور کام کرتا ہے۔

دراصل آدمی کی زندگی مختلف مظاہرِ حیات کے خواص کی جامع ہے اور پھر ان خواص سے اوپر اپنے کچھ امتیازات بھی رکھتی ہے۔ جن لوگوں نے اسے خاندانِ موجودات کا معمولی فرد قرار دیا ہے انھوں نے اس کی اصلیت کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ آدمی کا جسم چونکہ مادی عناصر سے بنا ہے لہٰذا ایک حد تک اس پر طبیعاتی قوانین کا سکہ بھی رواں ہے۔ پھر اس کے اندر نشو و نما اور نظام تغذیہ پایا جاتا ہے لہٰذا اس پر عالم نباتات کے قواعد بھی نافذ العمل ہیں۔ پھر وہ نفس یعنی احساس اور قوت ارادی رکھتا ہے اس وجہ سے اس پر ان قوانین کی حکومت بھی ہے جو حیوانات کی زندگی میں کارفرما ہیں، مگر یہ سب کچھ ہونے کے علاوہ وہ ترکِ اختیار کی قوت اور اخلاقی ذمہ داری کا منصب اور مدنیت کا زور دار جذبہ بھی رکھتا ہے، لہٰذا وہ کچھ اخلاقی قوانین بھی چاہتا ہے۔ حیاتِ انسانی کی اسی آخری خصوصیت کو موجودہ عمرانی فلسفوں نے ساقط النظر رکھا ہے اور اسے دوسرے پہلوؤں کے نیچے چھپا دیا ہے۔ انسان اپنی اس خصوصیت میں

قطعاً منفرد ہے اور اس پہلو سے جب ہم اس کے لیے زندگی کے اصول تلاش کرنا چاہیں تو خاندانِ حیات کے دوسرے افرادِ حی زندگیوں کا مطالعہ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کرتا ہے۔

جہاں تک طبیعاتی قوانین کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی خارجی قوت کے بل پر بہ جبر کائنات میں نافذ ہیں اور ان سے بغاوت کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ نباتاتی ضابطۂ فطرت بھی نباتات کی مرضی سے نہیں بلکہ کسی اقتدارِ بالادست کی طرف سے بربسرِ عمل ہے۔ پھر اس کا بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حیوانات بھی بگے بندھے ضابطوں کے پابند چلے آرہے ہیں اور ان کی ارادی حرکات اس ضابطہ کو توڑ نہیں سکتیں۔ یہ سارے قوانین ایسے ہیں جنھیں مشاہدہ اور تجربہ سے منضبط کیا جا سکتا ہے اور اسی سعی استنباط سے ہمارا علمِ طبیعات علم ادویہ، علم اعضاء اور علم افلاک اپنی موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ مگر ہماری تہذیبی اور اخلاقی زندگی پر بہ جبر کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہے بلکہ مصنوعی طریقوں سے کسی ضابطہ کو انسان خود اپنے اوپر نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلو میں تجربہ و مشاہدہ کا بس نہیں چلتا اور ہم کوئی قطعی رائے کسی معاملہ میں قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

اگر طبیعات، نباتات اور حیوانات کی زندگی کی طرح ہماری زندگی بھی مشیت یا فطرت یا کسی خارجی قوت کے پنجۂ جبر میں جکڑی ہوئی ہوتی تو تجربیت کی مدد سے ہم ایک سوال کا جواب بہت جلد نکال لیتے اور ایک سے زیادہ متضاد آرا کا چلن نہ ہوتا۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ جو اختلافِ آرا اور تصادمِ افکار انسانیت کی پیدائش کے روزِ اول سے چلا تھا وہ آج تک جاری ہے۔ ہر سوال کے متعدد جوابات بیک وقت انسان کے نوعی ذہن میں پائے جاتے ہیں اور ہر جواب پر ایمان لانے والے افراد کا چھوٹا یا بڑا گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

طبیعات کے میدان میں آپ دیکھتے ہیں کہ انسان نے جوں جوں نئی دریافتیں کیں قدیم ذرائع و وسائلِ حیات نابود ہوتے گئے۔ نئے آلات نے پرانے آلات کو میدان سے نکال دیا۔ نئی دریافتوں نے تمدن کی چمک دمک کو ہر قدم پر زیادہ بڑھا دیا۔ کتنا نمایاں ارتقاء ہے! مگر دوسری طرف تاریخِ تہذیب کا غیر طبعی پہلو ملاحظہ کیجیے تو آپ یہ ماننے کے لیے مجبور ہوں گے کہ تاریخ میں ارتقا کے بجائے تکرار و اعادہ کا ثبوت ملتا ہے۔ جو گناہ انسان نے ایک دفعہ سیکھا ہے وہ پھر اس کی نوعی زندگی کا ایک مستقل باب بن گیا ہے اور کچھ نہ کچھ انسان ہمیشہ اس کے علمبردار رہے ہیں۔ اسی طرح جو نیکی ایک دفعہ ایجاد ہوئی ہے وہ یکے بعد دیگرے انسانی نسلوں کی اجتماعی ذہنیتوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس کی شہادت اگر آپ چاہیں تو انسانی تہذیب و اخلاق کی تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے بکھری پڑی ہے۔

بطورِ مثال ناجائز معاشی انتفاع کو لیجیے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی ہر شکل کو دنیا کے ہر الہامی اور عقلی مذہب کے علمبردار نفرت سے دیکھتے رہے ہیں اور شاید اسے اضافی نیکی کی حیثیت دینے پر بھی کوئی تیار نہ ہوگا۔ یہ برائی انسان کے دورِ وحشت میں چھینا جھپٹی کی شکل میں برسرِ عمل تھی اور اس کے لیے جسمانی طاقت سب سے بڑا ہتھیار تھی۔ پھر جب سوسائٹی نے ادارۂ حکومت کو مکمل کر لیا اور مذہب نے اخلاقیات کو مستحکم بنا دیا تو اس نے ایک دوسری راہ پیدا کر لی یعنی علانیہ لوٹ مار میں جب رکاوٹیں پیدا ہو گئیں تو چوری چکاری اور نقب زنی کا فن ایجاد ہوا لیکن اس فن سے استفادہ کرنا بھی ضعیف البنیہ لوگوں کے لیے مشکل تھا اور پکڑے جانے کی شکل میں قانونی عقوبتوں اور رائے عامہ کی نفرین کی وجہ سے لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ لہٰذا اس فن کو اور ترقی ہوئی اور جوئے اور سود کے طریقے ایجاد ہوئے جو قانون کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک سکتے تھے۔ پھر جب مشین وجود میں آئی تو "سرمایہ" وسیلۂ کاربن گیا۔ اب تاریخ کی اس حرکت کا

کا مطالعہ کرنے والا شخص ذرائع اور وسائل کا رہیں تو ضرور ارتقا دیکھے گا مگر ان ذرائع و وسائل سے کام لینے والی ظالمانہ خواہش ہر دور میں ایک ہی پائی جائے گی، اس میں سر مو فرق نہ ہوگا۔ ذرائع و وسائل کے اس ارتقا سے دھوکا کھا کر ایک سطحی بین شخص ضرور یہ دعویٰ کر بیٹھے گا کہ تہذیب ارتقا کر رہی ہے مگر درحقیقت تہذیب کا یہ ارتقا صرف طبیعی پہلو سے ہے، اخلاقی پہلو کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ اخلاق کے اعتبار سے نوع انسانی کا ایک حصہ جس پستی میں آج سے چھ ہزار برس پہلے گرا ہوا تھا اسی میں آج بھی گرا ہوا ہے۔ آج بھی ناجائز معاشی انتفاع کی خواہش کا شیطان بدستور برسر کار ہے اور اس نے انسانی عقل کی مدد سے معاشی مظالم کو مہذب پیرایہ میں جاری رکھنے کے لیے بنکنگ سسٹم کے رنگین جال پھیلا دیے ہیں جن کے ٹھاٹھ دیکھ کر ایک عامی یہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید یہ ادارے تہذیبی ارتقا کی ٹھوس شہادت ہیں۔

پھر سیاسی کبریائی کے عظیم الشان گناہ کو لیجیے۔ اس کے متعلق بھی ہر شخص خواہ خدا پرست ہو یا دہریہ، یہ متفقہ رائے رکھتا ہے کہ کسی انسانی فرد یا گروہ کو دوسرے انسانوں کو اپنا بندہ بنا کر رکھنے کا حق نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری تہذیب برسوں کے ارتقا کے بعد بھی کیا اس شیطان کو میدانِ حیات سے خارج کر سکی ہے؟ جواب نفی میں ہے! بالکل ابتدائی دورِ مدنیت میں اس کا معصوم آغاز قبائلی کبریائی سے ہوا۔ یعنی جو قبیلہ مضبوط اور کثیر افراد پر مشتمل ہوتا تھا وہ دوسرے قبیلوں کو مسخر کر لیتا تھا۔ پھر جب بادشاہت جمانے کے فن میں ترقی ہوئی تو ملک فتح کرنا لازمۂ شاہی بن گیا۔ اسکندر، نپولین، اور چنگیز وہلاکو اسی سیاسی خداوندی کی مے کے متوالے تھے۔ موجودہ دور میں یہ بلا بلائے بے درماں ہو گئی ہے اور قوموں پر قوموں کی شہنشاہیت مسلط ہے۔

اس برائی کی تاریخ کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے تو حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ایک دور جسمانی قوت کا تھا اور اس دور میں اچھا جسم رکھنے والا فرد دوسرے افراد پر اقتدار جما لیتا تھا۔ پھر اوزاروں کے استعمال کی مہارت ذریعۂ اقتدار بنی۔ پھر بتخانوں کی مجاوری اور عبادت گاہوں کی پروہتی اور کہانت و فال گیری خدائی کا وسیلہ ٹھیری۔ پھر جاگیرداری استکبار کا ذریعہ قرار پائی۔ پھر سرمایہ داری اور ساہوکاری علو کا زینہ بنی۔ پھر دماغ کی تیز فعالیت بڑائی کی شاہ راہ بنی۔ نہ صرف یہ بلکہ حکومت کا ادارہ بھی ناخدا شناس سوسائٹیوں میں اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جب تک شہنشاہیت کا دور جاری رہا بادشاہ اور اس کے درباری اور حکومت کے کل پرزے سیاسی خدائی کے حصہ دار رہے۔ پھر جب دورِ جمہوریت کا آغاز ہوا تو اکثریت رکھنے والی پارٹیوں اور طبقوں نے کوس لمن الملک بجانا شروع کیا۔ پھر اسی جمہوریت سے یک جماعتی ریاست (One party state) کا تصور برآمد ہوا اور ایک جماعت نے ذہنی اور مادی طاقت کے بل پر استبداد کا علم بلند کیا (اس کی مثال روس اور جرمنی کا سیاسی نظام ہے)۔ اب غور کیجیے، کیا ارتقا اس معنی میں ہوا ہے کہ انسان برائی سے بھاگ کر اچھائی کی طرف بڑھا ہے، یا اس معنی میں کہ برائی کی اصل روح کو برقرار رکھ کر برائی کے طریقوں کو ترقی دی گئی ہے؟

برطانیہ میں سرمایہ داروں کی جو قوت حکمراں ہے وہ اس حق کے بل پر حکمراں نہیں ہے۔ بلکہ محض عیاری کے زور سے حکمراں ہے۔ جرمنی میں نازی اقتدار کی بنیاد یہ نہیں ہے کہ اس سے بہتر کوئی اقتدار ہو نہیں سکتا، اس کی بنیاد اس سخت گیری پر ہے جس نے پوری قوم کو ایک شکنجے میں جکڑ دیا ہے۔ روس میں مزدوروں کی پارٹی ڈکٹیٹر شپ اس وجہ سے نہیں چل رہی ہے کہ وہ فطرت کو محبوب ہے، بلکہ اس کے بقا کا راز وہ متشددانہ نظام ہے جس نے دماغوں کو، زبان وقلم کو اور عام جسمانی طاقتوں کو قانونیت میں بالکل کس دیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ ہمارے سیاسی نظام اپنی خارجی شکلوں کے لحاظ سے کتنے ہی چمکدار کیوں نہ ہوں! ان کے اندر "استبداد" کی

وہی "اژدہا" ناچ رہی ہے جس کی جنبش کی فیس "دمن" انسانی خون ہے۔ پھر یہ سب کچھ دیکھ کر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ارتقاء ہو رہا ہے۔

اور آگے بڑھیے! تعصب کو ہر انسان برا کہے گا اور کہتا رہا ہے، مگر یہ بلا اول روز سے آج تک انسان کی جان کی لاگو ہے۔ پہلے تعصب شاید زیادہ تر مذہبی مسلکوں کی حد تک کام کرتا تھا، مگر اب فلسفوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ آج کے آزاد خیالوں کو ٹٹول کر دیکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں عصر رواں کے خیالات کے حق میں شدید تعصب کارفرما ہے۔ مغرب مشرق کے باشندوں کے خلاف تعصب سے کام لیتا ہے، سفید فام آدمی رنگین جلد والی اقوام کے خلاف تعصب رکھتا ہے، ہر قوم دوسری قوم کے خلاف، ہر طبقہ دوسرے طبقہ کے خلاف، ہر سیاسی پارٹی دوسری سیاسی پارٹیوں کے خلاف شعوری یا نیم شعوری طور پر تعصب سے کام لیتی ہے۔ تہذیب اگر ارتقاء کر رہی ہے تو ہزاروں سال کی کوششیں ایسی پیش پا افتادہ برائی کا خاتمہ کیوں نہیں کر سکیں؟

انتہا پسندی صریحاً ایک برائی نظر آئے گی، مگر یہ جب ایجاد ہو گئی تو اب اس کا سلسلہ چل رہا ہے۔ واقعات کا یک رخا مطالعہ برا ہے، مگر یہ انسانی ذہنیت کا عام مرض ہے۔ اسباب و علل سے اپنے حسب خواہش نتائج اخذ کرنے کی عادت بہت مضر ہے، مگر آدمیت اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ جھوٹ نہ مٹ سکا، وعدہ خلافی ابھی تک باقی ہے، شراب نوشی جیسی مسلمہ برائی بحال ہے، فریب دہی جیسی اخلاقی بیماری دب دب کر ابھرتی ہے۔ پھر کیا اسی کا نام تہذیبی ارتقاء ہے؟

اس بحث کا مدعا یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ انسان "کتاب مقدس" کے منشاء کے مطابق "پیدائشی گناہگار" ہے اور اس کے پاس برائی ہی برائی ہے اور کچھ نہیں۔ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ نیکی اور بدی دونوں قسم کے محرکات سے مرکب ہے۔ اس میں کچھ رجحانات ایسے ہیں جو اسے ذاتی خواہش کا پرستار بنانے کے لیے برسرعمل رہتے ہیں اور کچھ ایسے داعیات ہیں جو اسے دوسرے ابنائے نوع کے مفاد کا لحاظ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ بیک وقت ایک فرد بھی ہے اور ایک ہیئت اجتماعیہ کا عضو بھی۔ یہ دونوں قسم کے محرکات ہر زمانہ میں برسرعمل رہتے ہیں اور ان میں تصادم جاری رہتا ہے اور انھیں کے زور کرنے سے کبھی تہذیب آگے کو حرکت کرتی ہے اور کبھی پیچھے کو۔ طبعی اسباب و وسائل کے لحاظ سے تمدن کی تاریخ آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے، لیکن ان اسباب سے کام لینے میں جن مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور جن اصولوں کو اختیار کیا جاتا ہے وہ روحی اعتبار سے مختلف ادوار میں یکساں رہتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے تہذیبی ارتقاء کے داعیوں نے نظرانداز کر دیا اور غلط بنیادوں پر علوم کی تشکیل کر ڈالی۔

حیات کی مجبورانہ حرکت

ہمارے علمائے مدنیات نے انسان کی ثقافتی زندگی سے جو دوسرا اصول اخذ کیا وہ یہ تھا کہ تہذیبی ارتقاء کا تسلسل انسان کی شعوری خواہش کے بغیر بحال رہتا ہے کیونکہ عضویاتی زندگی کی طرح ہماری تہذیبی زندگی بھی طبیعی نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور یہی طبیعی نظام اپنے اصولوں کے ماتحت ہمیں ایک لگے بندھے راستہ پر لیے جا رہا ہے۔ یہاں پھر ایک عظیم الشان غلطی کر دی گئی۔ انسان کو عام موجودات اور خصوصاً حیوانات سے ممتاز نہ سمجھنے کی وجہ سے موجودہ فلسفہ تمدن نے یہ ٹھوکر کھائی کہ جس صورت حال کو طبیعی، نباتاتی، اور حیوانی دنیاؤں میں کارفرما دیکھا اسی کو انسان پر بھی چسپاں کر دیا۔ کارخانہ طبیعت پورے کا پورا ارتقاء کر رہا ہے اور بغیر کسی نمایاں خواہش کے ارتقاء کر رہا ہے۔ اس میں نباتات اور حیوانات سب برابر کے شریک ہیں۔ سب اپنے کسی ارادہ کے بغیر مشیت کے دھکیلنے سے اصلیت کی راہ پر بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے یہ فرض کیا گیا کہ انسان بھی مشیت کے دباؤ سے ارتقاء کر رہا ہے۔

دراصل اس معاملہ میں مفکرین عہد جدید کی کوتاہی یہ تھی کہ وہ "شعور و اختیار" کی اس سرحدی لکیر کو نہ سمجھ سکے جسے پھاند کر زندگی جداگانہ

قسم کے حالات میں آ داخل ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے شعور و اختیار کو بالکل وہی حیثیت دی جو شیر کے پنجوں کی ہے اور ہاتھی کے سونڈ کی۔ ان کے لیے اس کے سوا دراصل چارہ بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ کائنات کے مطالعہ میں اول قدم پر ہی ایک ایسی غلطی کر آئے تھے جس سے غلطی در غلطی کی ایک مسلسل نسل کا چل نکلنا ناگزیر تھا۔ ان کی تحقیق کا فیصلہ یہ تھا کہ کائنات کے پس پردہ کوئی "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" شعور برسرِ عمل ہے ہی نہیں؛ یہ جو شعور کے آثار نظر آتے ہیں یہ سب کچھ مادہ و قوت کی اندھی فطرت کا کرشمہ ہے۔ بدیں وجہ انسان کے شعور کی اصل قیمت کا اندازہ ان کو نہ ہو سکا۔ حالانکہ مادہ و قوت کے اندھے پن سے ایک منضبط پیچیدہ نظم کو ارتقاء کی راہ پر ہمواری سے چلانے کا تخیل بالکل احمقانہ ہے۔ اگر خدا کے نام کے خلاف ان میں انتہائی تعصب موجود نہ ہوتا تو یہ حضرات بلا تامل تسلیم کر لیتے کہ مادہ کی مشینری جو قوت کی اسٹیم سے چل رہی ہے، اپنے پیچھے ایک ذی شعور موجد اور ڈرائیور رکھتی ہے۔ اس کی مشیت جو اندھی نہیں بلکہ سوانکھی ہے وہی بے جان عناصر کو گھسیٹ کر نباتات کی منزل پر لائی، پھر اس منزل سے آگے بڑھ کر اس نے حیوانات کا عظیم الشان چڑیا گھر سجایا پھر وہی زندگی کو دھکیلتی ہوئی انسانیت کی منزل پر پہنچا گئی جو کائنات کے مرکزی شعور کا بہترین اور آخری پیرایۂ ظہور ہے۔ یہ جو مشیت نے وجود کو شعور جلی کے مقام پر پہنچایا ہے تو اس کا مقصد یہ تھا کہ وجود کو دھکیل کر آگے چلانے کے بجائے اسے بطورِ خود حرکت کرنے کے قابل بنایا جائے اور اسے ارتقاء کی راہ پر بڑھنے کے لیے خارجی ہدایات کا حاصل ہو جانا کافی ہو۔ دوسرے لفظوں میں وجود کو مشین کی سطح سے اٹھا کر نائب کارندے کی سطح پر لایا گیا۔ پہلے وجود صرف موٹر گاڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی ڈرائیونگ فطرت کے ذمہ تھی، اب وجود کی ڈرائیونگ خود وجود کے شعور کی طرف منتقل ہو گئی اور فطرت کا کام یہ رہ گیا کہ وہ ڈرائیور کو اپنی سلطنت کی ٹیڑھی سیدھی راہوں کا پتہ دے اور ارتقاء کی راہ کی خارجی حد بندی کر دے۔ اسی خارجی رہبری کے لیے صاحب فطرت کی طرف سے سلسلۂ الہام و نبوت کا اجراء ہوا۔ مذہب کے احکام راہ ارتقاء کے دو طرفہ سرحدی نشانات اور علامات کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

شاید یہ کہا جائے گا کہ انسان جب شعور رکھتا ہے تو اس کو خارجی رہبری کی احتیاج ہی کیا ہے، خارجی ہدایت کی پابندی تو آزادی کی اس خواہش کے خلاف ہے جو شعور کے لازمہ کی حیثیت سے آدمی کی ذہنیت میں کام کر رہی ہے۔ اس کے جواب میں اوپر والی مثال ہی کافی ہے۔ اگر ایک مشین کا صانع اور مالک اس کے صحیح استعمال کے لیے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیتا ہے تو یہ ڈرائیور کی آزادی سلب کرنا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی سڑک کو نشانات سے محدود کر دیا جاتا ہے تو اسے مسافر کی آزادی میں مداخلت بے جا نہیں کہا جا سکتا۔ آزادی کو تصادم کی آزادی اور کھڈ میں جا گرنے کی آزادی کا ہم معنی سمجھنا محض ایک حماقت ہے۔ اگر کوئی مسافر رہنمائی کو اپنے شعور و اختیار کی توہین سمجھے اور اصرار کرے کہ میں اپنا راستہ خود بناؤں گا تو مختلف سمتوں پر سفر کا تجربہ کرنے اور بہترین شاہ راہ کو تلاش کرنے میں اس کی پوری عمر صرف ہو جائے گی۔ یہی حال نوعِ انسانی کا ہے۔ یہ مسافر صدیوں کی کوشش کے بعد بھی نہ تو اس نظامِ عالم کو سمجھ سکا ہے جس میں یہ سانس لے رہا ہے، نہ خود اپنے آپ کو سمجھا ہے، نہ اپنے تمدن کے بنیادی مسائل کو سمجھا ہے اور نہ مختلف تہذیبی اصولوں کی آزمائش سے فارغ ہوا ہے۔ کیونکہ ایک ایک تہذیبی اصول کی آزمائش صدیوں کی مہلت چاہتی ہے۔ شاید ہماری نوعی زندگی کی پوری مہلت گزر جانے پر ہمارا شعور ان اسرار سے پورے طور پر واقف ہو جائے جو تمدن کی گاڑی کو ارتقاء کی راہ پر بڑھائے جانے کے لیے ضروری ہیں۔

بہر حال ہمارا مدعا یہ عرض کرنا ہے کہ علمائے عمرانیات نے شعور کی ذمہ داری کو نہ سمجھا۔ شعور کے ہونے کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ آدمی

پر خیر اور شر دونوں قسم کی شاہ راہیں کھل گئی ہیں اور وہ دونوں پر گامزن کرتا چلا آ رہا ہے۔ ورنہ اگر فی الواقع ارتقا کا تسلسل غیر منقطع ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "شر" ہماری زندگی میں ہے ہی نہیں۔ اگر "شر" نہیں ہے تو "خیر" کا تصور بھی ناممکن ہے۔ پھر ان دونوں تصورات کو نکال دینے کے بعد آپ کے پاس رہ کیا جاتا ہے اور آپ شعور کا دعویٰ ہی کس بنا پر کرتے ہیں؟

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ آدمی خیر اور شر دونوں پر قادر ہے اور ان میں سے کسی ایک رویہ کو انتخاب کرنے کی آزادی بھی رکھتا ہے، یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے کہ تہذیبِ انسانی میں لازماً ارتقا ہی ارتقا نہیں بلکہ تنزل بھی ہے اور یہ ارتقا جبری نہیں بلکہ ارادی ہے۔ جب کبھی انسان اپنے رویّہ کو خیر کے سانچے میں ڈھالے گا تو ارتقا ہوگا اور جب اس کی زندگی کی سوئی "شر" کی سمت میں گھوم جائے گی تو تہذیبی انحطاط کا دور شروع ہو جائے گا۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی و طبقاتی، قومی اعمال ہوں یا نوعی، ان سب پر یہی اصول حاوی ہے۔

یہ واقعہ مسلم ہے کہ آدمی حیوانی اور انسانی، انفرادی اور اجتماعی، انتہا پسندانہ اور معتدلانہ، عقلی اور جذباتی، دوہری قوتوں سے مسلح ہے اور دونوں قسم کی قوتوں کو تحریک دینے والے لاتعداد محرکات زور کرتے رہتے ہیں۔ ایک نوعیت کی قوتیں ابھرتی ہیں تو حیات کی حرکت اپنی فطری سمت میں جاری ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب دوسری نوعیت کے خارجی محرکات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو دوسری نوعیت کی ذہنی قوتیں سطح پر آ جاتی ہیں اور حیات کی حرکت ایک دوسری سمت میں ہونے لگتی ہے۔ زندگی کی اس دو سمتی حرکت کے ساتھ طبیعی میدان میں ارتقا جاری رہتا ہے۔ مگر ماحول کے اس گہرے اثر کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں جبریت کار فرما ہے۔ نہیں! اس ظاہری جبریت کے ساتھ ساتھ انسان کا ارادہ بھی تہذیبی اور اخلاقی اعمال کی تشکیل میں شامل رہتا ہے۔ آدمی اگر پوری طرح اپنے آپ کو ماحول کے پنجے میں دیتا ہے تو بھی اپنی قوتِ ارادی کی بنا پر اور اگر وہ ماحول پر غالب آنے کے لیے اپنے آپ کو بعض اصولوں کا پابند بناتا ہے تو بھی اپنے انتخاب سے۔ یہ ارادہ و انتخاب اس کی تہذیبی کارگزاریوں کی پوری ذمہ داری خود اس پر ڈال دیتا ہے۔

ہماری نوعی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے متضاد فکری عوامل رسہ کشی میں مصروف ہیں۔ ہر تمدنی دور میں کچھ انسان ایک قسم کے عوامل کی گرفت میں کام کرتے ہیں اور کچھ دوسری قسم کے عوامل کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ بعض "خیر" کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور بعض "شر" کی طرف، اور عقل بلا امتیاز دونوں گروہوں کو رنگا رنگ وسائل کار فراہم کر کے دیتی رہتی ہے۔ جو انسانی گروہ زیادہ وسائل کار اور قوتِ کارکردگی حاصل کر لیتا ہے وہ اونچا اٹھ جاتا ہے اور اس کی بنائی ہوئی تہذیب، اس کی سیاست، اس کے اخلاق، اس کے علوم و فنون فضا پر قبضہ کر لیتے ہیں، مگر دوسرے عوامل اندر اندر زور کرتے رہتے ہیں اور آخر کار جب انہیں انقلاب اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے تو باگ ان کے قبضہ میں آ جاتی ہے۔ گویا طبعی ارتقا کے لباس میں اخلاقیاتی اور تہذیبی تکرار کا عمل جاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری تہذیبی حرکت مسلسل اور ایک رخی نہیں ہے، یہ حرکت لنگر کی سی حرکت ہے اور اس کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک انسانی شعور پر ہے۔ (باقی)

رسائل و مسائل

تقلید و عدم تقلید

سوال ۱: "تقلید ائمہ اربعہ کو گروہ "اہل حدیث" حرام و شرک بتاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا مقلدین اہل حدیث نہیں ہیں؟ تقلید اصل میں کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے؟"

جواب: اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے، ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ ائمہ کی پیروی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان ائمہ نے اللہ اور رسول کے احکام کی چھان بین کی، آیات قرآنی اور سنت رسول سے معلوم کیا کہ مسلمان کو عبادات اور معاملات میں کس طریقہ پر چلنا چاہیے اور اصولِ شریعت سے جزئی احکام کا استنباط کیا۔ لہٰذا وہ بجائے خود آمر و ناہی نہیں ہیں، نہ بذاتِ خود مطاع اور متبوع ہیں، بلکہ علم نہ رکھنے والے کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ جو شخص خود احکام الٰہی اور سننِ نبوی میں نظرِ بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اصول سے فروع کا استنباط کرنے کا اہل نہ ہو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علماء اور ائمہ میں سے جس پر بھی اسے اعتماد ہو اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اس حیثیت سے ان کی پیروی کرتا ہے تو اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص ان کو بطور خود آمر و ناہی سمجھے یا ان کی اطاعت اس انداز سے کرے جو اصل آمر و ناہی کی اطاعت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہو، یعنی ائمہ میں سے کسی کے مقرر کردہ طریقہ سے ہٹنے کو اصل دین سے ہٹ جانے کا ہم معنی سمجھے اور اگر کسی ثابت شدہ حدیث یا صریح آیتِ قرآنی کے خلاف ان کا کوئی مسئلہ پایا جائے تب بھی وہ اپنے امام ہی کی پیروی پر اصرار کرے تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا۔

سوال ۲: فرقہ وہابیہ کا بانی کون تھا؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے؟ ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں؟ کیا علمائے اسلام نے اس کی تردید نہیں کی؟ اگر کی ہے تو کس طریقہ پر؟ آیا اس فرقہ نے اشاعتِ اسلام میں حصہ لیا ہے یا مخالفتِ اسلام میں؟

جواب: "وہابی" دراصل کسی فرقہ کا نام نہیں ہے۔ محض طنز اور طعن کے طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے جو یا تو اہل حدیث ہیں، یا محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو ہیں۔ اہل حدیث کا مسلک تو قدیم ہے، ائمہ اربعہ کے زمانہ سے چلا آتا ہے اور یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو، تو وہ دراصل حنبلی طریقہ کے لوگ ہیں، ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کے تھے۔ ہندوستان میں یہ موخرالذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہاں وہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اول اول نہایت اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں اچھے افراد پائے جاتے ہیں، مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہو گئے ہیں جو خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں۔ اور ایسے ہی جاہل خود حنفی کہلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری مناظرہ و مباحثہ اور فرقہ بازی کی

گرمیِ بازار ابھی دونوں فریقوں کی برکت ہے۔

سوال ۳: کیا کسی حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اٹھے گا؟ کیا یہ حدیث مذکورہ بالا فرقہ پر منطبق ہوتی ہے؟

جواب: نجد یا مشرق کی طرف سے ایک فتنہ کے اٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے، مگر اس کو محمد ابن عبدالوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندھے جوش کا نتیجہ ہے۔ ایک فریق جب دوسرے فریق سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر ہتھیار اس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ خدا اور رسول کو بھی ایک فریقِ جنگ بنانے میں دریغ نہیں کرتا۔

سوال ۴: بعض اعمال میں اقوال حضرت امام اعظم بظاہر احادیثِ صحیحہ کے خلاف پائے جاتے ہیں۔ جیسے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، شرط مصر فی صلوٰۃ الجمعہ وغیرہ۔ تو کیا امام موصوف کے اقوال قرآن و احادیث سے مستنبط ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ احادیث کونسی ہیں؟ کیا وہ عند المحدثین صحیح ہیں؟

جواب: امام ابوحنیفہ، امام شافعی، اور امام مالک کے مذہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر اہلِ حدیث کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہیں اور ان ائمہ کے پیرووں کی طرف سے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ جو شخص خود علم رکھتا ہو اور جس میں خود اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو وہ فریقین کے درمیان محاکمہ کر سکتا ہے اور اسے حق ہے کہ حدیث سے جس طریقہ کو ثابت پائے اسے اختیار کرے اور جسے ثابت نہ پائے اسے چھوڑ دے۔ لیکن یہ عام اہلِ حدیث جو ان مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں ان کا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا ہے۔ یہ اپنے ائمہ و علماء پر اعتماد کرتے ہیں اور حنفی اپنے ائمہ و علماء پر۔ ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں، نہ یہ احادیث کا اتنا علم اور اصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کر سکیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فاتحہ خلف الامام یا رفع یدین یا آمین بالجہر حدیث سے ثابت ہے اور اس کا خلاف ثابت نہیں ہے، دراصل تقلید کی بنیاد پر ہے، نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر۔ لہٰذا ان کے جواب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ البتہ جو علم رکھتے ہیں وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے اس کی رو سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جب امام آواز بلند پڑھ رہا ہو تو مقتدی چپ ہو رہیں، اور جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی فاتحہ پڑھیں۔ اس طرح کسی حکمِ قرآنی اور کسی حدیث کی خلاف ورزی کا خدشہ نہیں رہتا اور تمام مختلف دلائل کو دیکھ کر یہ ایک متوسط طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ امام مالک اور امام احمد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جو شخص امام کے پیچھے کسی صورت میں بھی فاتحہ نہیں پڑھتا یا ہر حال میں پڑھتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی، کیونکہ دونوں مسلکوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں اور وہ شخص جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، بلکہ جو حکم اس کے نزدیک دلیل سے ثابت ہے اسی پر عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر وہ الزام نہیں رکھا جا سکتا جو حکمِ شرعی کی بالقصد مخالفت کرنے والے پر رکھا جاتا ہے۔

رہا "رفع یدین" اور "آمین بالجہر"، تو ان کے فعل اور ترک دونوں کی تائید میں دلائل مجھ کو تقریباً مساوی الوزن نظر آتے ہیں۔ اس لیے جو ان افعال کو کرتا ہے وہ بھی حدیث کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے اور جو انہیں ترک کرتا ہے اسے بھی مخالفتِ حدیث کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ شریعت علیہ السلام نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے، اور اسی طرح صحابہ کرام نے بھی۔ اب ایک شخص جس طریقہ کی بھی پیروی کرتا ہے وہ صاحبِ شریعت ہی کا متبع ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیریت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یا اسے اپنے ہی پسندیدہ طریقہ کی طرف تشدد سے کھینچا جائے۔ ہاتھ اٹھانا یا نہ اٹھانا، اور آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا کوئی ایسے اہم فعل نہیں کہ ایک کا التزام اور دوسرے کے ترک کا اہتمام کیا جائے۔

نماز جمعہ میں شرط مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔ میری تحقیق یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے خود امام ابو حنیفہ ہی کے استدلال واستنباط کو اس معاملہ میں نہیں سمجھا۔ امام صاحب کا مدعا صرف یہ تھا کہ اقامت جمعہ ایسی آبادیوں میں ہو جو اپنے علاقہ کے اندر مرکزی حیثیت رکھتی ہوں اور یہ حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن بعد کے لوگوں نے مصر کا مدلول متعین کرنے میں کھینچ تان کی اور متعدد ایسی شرطیں بڑھا دیں جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث ترجمان القرآن میں کی جا چکی ہے۔

سوال ۵: تفہیمات کا مضمون "مسلک اعتدال" جماعت اہل حدیث میں بہت سی غلط فہمیوں کے پھیلنے کا باعث ہو رہا ہے اور منکرین حدیث اس کے اقتباسات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس مضمون کو تفصیلات و اشتملہ طعن و جرح محدثین سے خالی کر کے از سر نو شائع کیا جائے[1]۔ یہ بات جماعتی ترقی و استحکام کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

جواب: میں اس بات کو صاف صاف واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں موجودہ زمانہ کے اہل حدیث اور مقلدین دونوں کا ہم خیال نہیں ہوں اور میرے نزدیک دونوں گروہ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اس چیز کے دلائل اگر کبھی فرصت ہوئی تو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔ سردست صرف اتنی گزارش پر اکتفا کرتا ہوں اور یہی گزارش حضرات مقلدین سے بھی کر چکا ہوں کہ براہ کرم مجھے اپنے مخصوص مسلک کی طرف کھینچنے کی کوشش نہ کریں۔ اسی انتہا پسندی کی بدولت بہت سی خرابیاں واقع ہو چکی ہیں اور اب اگر کوئی شخص اصلاح کرنا چاہتا ہے تو یہی انتہا پسندی مانع آکر اس کے راستہ میں مزاحم ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ مجھے اپنے طریقہ پر کھینچیں میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ لوگ خود اپنی جگہ بہت ٹھنڈے دل سے تحقیق کریں کہ آیا فی الواقع سنت کی پیروی کی وہی شکل صحیح ہے جو اہل حدیث حضرات نے اختیار کی ہے؟

سوال ۶: ذیل میں آپ کے لٹریچر سے چند اقتباسات درباره مسئلہ تقلید و اجتہاد درج کر کے کچھ استفسارات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سے صرف علمی تحقیق مقصود ہے، بحث مقصود نہیں:

۱۔ "تمام مسلمان چاروں فقہوں کو برحق مانتے ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ ایک معاملہ میں ایک ہی طریقہ کی پیروی کی جا سکتی ہے، اس لیے علماء نے طے کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو ان چاروں میں سے کسی ایک ہی کی پیروی کرنی چاہیے" (رسالہ دینیات ص ۱۰۵ طبع دوم)

۲۔ "پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس حدیث کو وہ (محدثین) صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین ان کو خود بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطہ نظر زیادہ تر اخباری تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا اس لیے فقیہانہ نقطہ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے جائے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں دو کمزوریاں موجود ہیں، ایک بلحاظ اسناد، ایک بلحاظ تفقہ" (تفہیمات مضمون مسلک اعتدال)۔

۳۔ "دراصل بات کا قوی امکان تھا کہ رجال کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں محدثین کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔" (ترجمان جلد ۱۰، عدد ۲ ص ۱۱۰)

۴۔ "رہا فقیہانہ نقطہ نظر، تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں

[1] واضح رہے کہ "تفصیلات و اشتملہ" جو بعض حضرات کو سخت ناگوار ہیں، علامہ ابن عبد البر کی کتاب جامع بیان العلم سے ماخوذ ہیں۔ م۔

سے دخیل ہو جاتا تھا۔"........" اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انھوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ وہ معنیً صحیح ہے۔"........ "مگر جو لوگ شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر فقیہانہ نقطۂ نظر بار ہا ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء و مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔ روایت کو بالکلیہ رد کرنا بھی غلطی ہے اور روایات پر ہی اعتماد کرنا بھی غلطی ہے۔ بلکہ مسلکِ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہی وہ مسلک ہے جو ائمۂ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔"

اب ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر حسبِ ذیل سوالات پر روشنی ڈالیے:۔

ا۔ مسلمان کا چاروں فقہوں کو ماننا کس نص کے ماتحت ہے؟

ب۔ اسنادِ حدیث اور تفقۂ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے؟

ج۔ تفقۂ مجتہد اور اسنادِ حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنیت ہے؟

د۔ محدث و فقیہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اسے نرے محدث یا نرے فقیہ پر فضیلت ہے یا نہیں؟

س۔ کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابوحنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد کو چھوڑا ہو۔

ش۔ کیا یہ قول ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابلِ قبول ہے، صحیح ہے؟

ص۔ درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسناد صحیح رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرطِ درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے؟

ط۔ کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا و رسول کا حکم ظنِ غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جبکہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب:۔ ا۔ چاروں فقہوں کا برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے، بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چاروں فقہی مذاہب کتاب و سنت سے استنباط کرنے کے ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کتنی ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً استنباطِ احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباطِ مسائل میں کام لیا تھا۔

ب۔ اسنادِ حدیث اور تفقۂ مجتہد میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ اسنادِ حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے، وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے اور تفقۂ مجتہد ایک ایسے شخص کی فیصلہ کن رائے ہے

(Judgement) ہے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابلِ قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظامِ شریعت میں کہاں تک نصب (Fit) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (Unfit) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے، یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہرحال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلہ پر مقدم ہوتی ہیں۔

ج۔ نفسِ مجتہدین میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسنادِ حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہادات اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کر کے حکمِ شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکمِ شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہو سکتا ہے اور ایسا شخص نرے محدث یا نرے فقیہ کے مقابلہ میں اصولاً قابلِ ترجیح ہے، لیکن میرا یہ جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے۔ یعنی کسی شخص خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظِ حدیث میں ہے۔

س۔ اس وقت میرے پیشِ نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے۔ میں اس خط کا جواب سرسری لکھوا رہا ہوں۔

ش۔ ائمہ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب و سنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں ان سے اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

ص۔ درایت سے مراد وہ فہمِ دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی قدر رکھتی ہے جو درجہ "حذاقت" کا فنِ طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنہیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب و سنت میں حاصل ہوئی ہو، کام نہ لیں تو میرے نزدیک گنہگار ہوں گے۔

میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت در فقہ اور فہمِ دین کا کوئی ایسا معیار بنا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا، جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحبِ فن کی فنی مہارت کا کوئی ناپا تُلا معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضمن ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعین کرنے میں غلطی کر کے بھی ویسا ہی مجرم ہو گا۔ حالانکہ شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ۔۔۔ کی حد تک ہی بار ڈالتی ہے، اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

سوال ۶ :- تقلید ائمہ اربعہ کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے، یعنی تقلید کو آپ کسی حد تک جائز سمجھتے ہیں یا نہیں ؟ اور اگر جائز سمجھتے ہیں تو کس حد تک ؟ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں، آپ ایک وسیع المشرب مقلد ہیں۔

جواب :- میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحب علم آدمی کو براہ راست کتاب و سنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس تحقیق میں علمائے سلف کی ماہرانہ آراء سے بھی مدد لینی چاہیے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنا چاہیے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب و سنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، پھر جو چیز اس کو حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔ میں نہ مسلک اہل حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں۔ لیکن جماعت میں جو لوگ شریک ہوں، وہ اگر گروہ بندی کے تعصبات سے پاک ہو جائیں اور حق کو اپنے ہی گروہ کے اندر محدود نہ سمجھیں تو وہ جماعت میں رہتے ہوئے اپنے اطمینان کی حد تک حنفی، شافعی یا کسی دوسرے مسلک پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

سوال ۷ :- (سوال ۱۰ کا جواب الجواب) دوبارہ عرض ہے کہ "تفہیمات" کا مضمون "مسلک اعتدال" جس میں صحابہ کرام اور محدثین کی باہمی تجریحات کو نقل کیا گیا ہے اور اجتہاد مجتہد اور روایت محدث کو ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس مضمون سے حدیث کی اہمیت کم اور منکرین حدیث کے خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ یہ رائے نہایت درجہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کے سوالات اگر آپ کے نزدیک بنیادی اہمیت نہیں رکھتے تو جماعت اسلامی کی ابتدائی منزل میں محدثین و فقہاء اور روایت و درایت کے مسئلہ پر قلم اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ اس مسئلہ کے چھیڑ دینے سے غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں اب بہتر یہ ہے کہ بر وقت ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ کیونکہ حدیث کی اہمیت کو کم کرنے والے خیالات جس لٹریچر میں موجود ہوں، اسے پھیلانے میں ہم کیسے حصہ لے سکتے ہیں، حالانکہ نظم جماعت اسے فرض قرار دیتا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں مع تنقید اخبارات و رسائل میں شائع کر دی جائیں۔

جواب :- فقہی مسائل میں اجتہاد و استنباط کے اصول اور طریقوں کے متعلق غالباً پہلے بھی کبھی کوئی شخص ایسی بات نہیں کہہ سکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور جس پر سب لوگ متفق ہو جائیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو آپ کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان اختلافات کے لیے کافی گنجائش خود کتاب اللہ اور ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے سلف صالحین کے درمیان ہر دور میں اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر کیا ان اختلافات کا منشا یہی تھا کہ اصل دین کی دعوت و اقامت کے لیے بھی مسلمان کبھی ایک جماعت نہ بن سکیں ؟ اور اگر صدیوں میں کوئی ایسی جماعت کبھی بنے تو فقہی مسائل پر کلام کرنا چھوڑ دیا جائے ؟ یا نہیں تو پھر سارے فقہی اختلافات کو پہلے صاف کیا جائے ؟ اگر آپ کا نقطۂ نظر یہی ہے تو مجھے اس پر افسوس ہے اور سوائے اس کے کہ میں اس کو بدقسمتی سمجھوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے تو پھر براہ کرم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ ہماری یہ جماعت اصل دین کی دعوت و اقامت کے لیے کھڑی ہوئی ہے اور اس کام میں تمام ان فقہی مسالک کے آدمیوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے جن کے اصول اور طریقوں کے لیے قرآن و حدیث میں بنیادیں موجود ہیں۔ لیکن یہ اجتماع اسی طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کو مسائل فقہیہ میں اصولی گنجائشوں کی حد تک تحقیق کی آزادی حاصل رہے۔ اور یہ آزادیٔ تحقیق ان مختلف المسلک لوگوں کے درمیان ایسی نزاع کی موجب نہ بنے جو نفس اجتماع برائے اقامت دین میں مانع ہو۔ اسی وجہ سے

میں اس بحث کو ٹال رہا ہوں جسے آپ لوگ بار بار چھیڑ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کے لیے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے، وہی ذہنیت بار بار برسرِ کار آتی چلی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام دین کی اصل و اساس بس وہی امور ہیں جو آپ معرضِ بحث میں لا رہے ہیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان چیزوں پر بحث کرنے کے لیے اتنا وقت حاصل نہیں ہے جتنا آپ حضرات کو حاصل ہے، اس لیے مختصر مختصر جوابات اپنے خطوط میں دیتا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا منشا یہی ہے کہ میں دوسرے کام چھوڑ کر انھیں بحثوں میں الجھ جاؤں تو بسم اللہ، ایک مفصل مضمون روایت اور اجتہاد کی توضیح میں لکھ دوں گا، مگر یقیناً اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ آپ حضرات کو اطمینان ہو جائے، بلکہ ہو گا یہ کہ جماعت کے اندر اور باہر کے تمام اہلِ حدیث حضرات میرے ساتھ اس بحث میں الجھ جائیں گے اور ہمارے لیے ایک نصب العین پر جمع ہو کر کام کرنا محال ہو جائے گا۔ پھر یہ فساد اس مقام پر بھی ختم نہیں ہو گا، بلکہ جب ان بحثوں کا دروازہ کھلے گا تو میرے وہ مضامین بھی زیرِ بحث آ جائیں گے جن پر کچھ حنفی حضرات آپ لوگوں کی طرح بگڑے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے محاذ پر ویسی ہی ایک اور جنگ شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ ایک مرتبہ پھر مجھے سوچ کر لکھیے کہ کیا یہی آپ کا منشا ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر یہ باتیں بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں تو جماعت کی ابتدائی زندگی میں ان پر قلم اٹھانا مناسب تھا، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب تک میں نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو، اور اگر میں یہ فیصلہ کر لوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار ہو تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔ مگر یقین کیجیے کہ اس معاملہ میں جتنا ناکام میں ہوا ہوں، اس سے شاید بہت زیادہ ناکام آپ حضرات ثابت ہوں گے۔ اگر آپ اس دعوت کے لیے کام کرنے کھڑے ہوں تو غالباً چند صفحے بھی ایسے نہ لکھ سکیں جو اہلِ حدیث حضرات کے سوا کسی دوسرے گروہ کو ناگوار ہوئے بغیر رہ سکتے ہوں۔ پس خوب سمجھ لیجیے کہ اصل چیز ان مباحث سے پرہیز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو کچھ لکھے یا کہے وہ معقولیت کو برقرار رکھتے ہوئے، حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، شانِ تحقیق کے ساتھ لکھے، اور دوسرے لوگ جو اس کے سننے والے یا پڑھنے والے ہیں، ان کے اندر کچھ قوتِ تحمل، کچھ وسعتِ قلب، کچھ رواداری اور کچھ اصول و فروع کی تمیز موجود ہو۔

آپ کا یہ خیال تو بہت ہی عجیب و غریب ہے کہ جب لٹریچر میں کوئی وجہ اختلاف موجود ہے تو اسے کیسے پھیلایا جا سکتا ہے۔ ذرا مجھے کوئی ایسا لٹریچر بتا دیجیے جس میں تمام چیزیں تمام لوگوں کے منشا کے مطابق ہی ہوں۔ موجودہ دور میں نہیں، متقدمین کے دور میں ہی بتلا دیجیے۔

اگر اس بحث کا فیصلہ اس طرح ہو سکے کہ آپ یا آپ کے ہم خیال حضرات میں سے کوئی صاحب میری تحریروں پر ایک تنقید لکھ کر شائع کر دیں تو میں اس کو دل سے پسند کروں گا اور اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی نہ لکھوں گا تاکہ کسی طرح اس قضیہ کا خاتمہ تو ہو۔

سوال ۹: قرآن کے بعد احادیثِ نبویہ کو دینی و شرعی حجت ماننے یا نہ ماننے میں ہمارے اہلِ فکر و نظر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں تفریط تو یہ ہے کہ ذخیرۂ احادیث کو تاریخی روایات کی حیثیت دی جائے اور افراط یہ ہے کہ احادیثِ صحاح میں "قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے الفاظ سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہو اسے کلیتہً رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حدیث سمجھ لیا جائے اور اس پر دین و اعتقاد کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ میں اپنی معلومات کی کمی اور فکر و نظر کی کوتاہی کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نقطۂ اعتدال نہیں پا سکا۔ براہِ کرم آپ ہی رہنمائی فرمائیے اور ان شبہات کو صاف کر دیجیے۔

کیا احادیث کی تحقیق و تنقیح اور راویوں کے حالات کی تفتیش کا کام اگلے محققین پر ختم ہو گیا؟ اگر جواب اثبات

میں ہے تو اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اور پھر اس کے کیا معنی کہ صحیح بخاری تک میں ایسی حدیثیں موجود ہیں جو نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں محل اعتراض ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا تین مرتبہ جھوٹ بولنا، حضرت موسیٰ کا ملک الموت کی آنکھ پر گھونسہ مارنا وغیرہ روایات کو ملاحظہ کیجیے۔

نیز اگر جواب نفی میں ہو تو بتلائیے کیا وجہ ہے کہ اب تک صحیح اور غلط احادیث کو چھانٹ دینے کا فریضہ متاخرین علمائے اسلام نے انجام نہیں دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مشتبہ روایات پر وارد ہونے والے اعتراضات تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جواب:- میں اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ احادیث کی تنقید و تحقیق و ترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوا ہے وہ اگرچہ نہایت قابل قدر ہے مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علماء نے پھر یہ کام کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دیا ہو ان سے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھانٹ پرکھ کا کام کیوں نہیں کیا۔

سوال ۳:- ہمارے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہو گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم و فضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حقدار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر طحطاوی میں ایک بڑے صاحب کمال فقیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے:

"المنتقل من مذهب الى مذهب باجتهاد وبرهان اثم يستوجب التعزير"

جواب:- میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر بیاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز، اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔ رہا طحطاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے، تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو میں اس کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہش نفس کی بنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بنا پر۔

سوال ۴:- ایسا اجماع جو کسی صحیح حدیث پر مبنی ہو واقعی شرعی حجت ہے اور ایسے اجماع کا منکر یقیناً کافر ہے۔ لیکن ایسا اجماع جو علماء نے کسی اپنے نقطہ نظر پر کر لیا ہو جو مخبر صادق کے لفظوں سے صراحۃً ثابت ہو یا کسی ایسی حقیقت سے تعلق رکھتا ہو جس کی تصریح شارع علیہ السلام نے نہ کی ہو اور اسے مصلحتاً مجمل ہی رہنے دیا ہو، کیا یہ بھی شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے؟

جواب:- اجماع کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ اجماع سے مراد امت کا متفقہ فیصلہ ہے، اور یہ متفقہ فیصلہ لامحالہ دو ہی قسم کے امور سے متعلق ہو سکتا ہے۔ ایک قسم کے امور وہ جو احکام شرعی میں سے ہوں۔ دوسری قسم کے امور وہ جو دنیوی تدابیر کے قبیل سے ہوں۔ پہلی قسم کے امور میں سے کسی امر میں اگر امت متفق ہو کر کسی حکم منصوص کی تشریح کرے اور وہ تشریح کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کو پیش نظر رکھ کر نہ کی گئی ہو، بلکہ اصولاً شارع کا منشا یا سنت کا طریقہ متعین کیا گیا ہو تو ایسا اجماع یقیناً حجت ہے اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے۔ اور اگر کسی مصلحت وقتی کو ملحوظ رکھ کر کسی حکم کی تشریح کی گئی ہو تو ایسے اجماع کی پابندی اس وقت تک امت پر لازم ہو گی جس وقت تک وہ مصلحت باقی ہے۔ حالات بدل جانے کے بعد اس کی پابندی لازم نہیں رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی اجماع کسی حکم شرعی کی تشریح

کے متعلق نہ ہو، بلکہ کسی تدبیرِ دنیوی کے متعلق امت نے متفق ہو کر طے کر لیا ہو کہ اس طرح عمل کیا جائے گا تو اگر اصولِ شریعت میں اس طرزِ عمل کے لیے کوئی گنجائش موجود ہو تو ایسا اجماع واجب العمل ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ نیز یہ کہ ایسا اجماع کبھی دائمی اور ابدی وجوب کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک زمانے کے مسلمان یا ایک ملک یا ایک قوم کے مسلمان کسی تدبیر یا کسی کام پر اتفاق کریں اور دوسرے زمانہ میں اسی قوم یا اسی ملک کے لوگ کسی اور امر پر اتفاق کر لیں۔ یہ ملکی اور قومی اور زمانی اجماع صرف ایک خاص زمانے اور خاص ملک یا قوم کے مسلمانوں ہی کے لیے واجب العمل ہو سکتے ہیں۔ بعد کے زمانے والوں یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو اگر اس میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہو تو یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ چونکہ پہلے فلاں خاص امر پر اجماع ہو چکا ہے یا فلاں ملک میں اس پر اتفاق ہو چکا ہے اس لیے اب اس کے بارے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔

سرکاری نرخ بندی پر چند سوالات

سوال ۱:۔ حکومت ایک جماعت کو کچھ اشیاء ارزاں قیمت پر مہیا کرتی ہے۔ دوسری جماعت کے افراد اس رعایت سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ پھر کیا موخر الذکر طبقہ کا فرد پہلی جماعت کے کسی فرد کے ذریعہ حکومت کی اس رعایت سے استفادہ کر سکتا ہے؟ مثلاً مروت یا دباؤ سے رعایت پانے والی جماعت کا کوئی فرد محروم رعایت جماعت کے کسی فرد کو کوئی چیز اپنے نام سے کم قیمت پر خرید کر دے سکتا ہے؟ یا اس کی کسی پرانی چیز کو نئی چیز سے بدلانے کا شرعاً جواز ہے؟

جواب:۔ آپ نے جس معاملہ کا یکجا ذکر کر دیا ہے وہ دراصل دو مختلف پہلو رکھتا ہے جن کا حکم مختلف ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی خاص گروہ کے لیے نرخوں میں جو رعایت کی گئی ہے اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ یہ بات حکومت کے قانون کی رو سے ناجائز ہو تو ہو، اخلاقاً اس میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت اس وقت قیمتوں کا چڑھاؤ کسی اصلی گرانی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ محض ایک مصنوعی چڑھاؤ ہے جو حکومت اور ملک کے سرمایہ دار طبقہ نے بالکل ارادۃً پیدا کیا ہے۔ عام باشندے اس گرانی سے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت کر دیے گئے ہیں۔ بعض خاص گروہوں کے ساتھ جو رعایت کی جا رہی ہے، درحقیقت تمام باشندگانِ ملک اس کے مستحق تھے لیکن حکومت نے ملک میں عام گرانی پیدا کر کے اپنی خاص خدمات انجام دینے والوں کے لیے کچھ رعایتیں اس غرض سے کی ہیں کہ ان رعایتوں کے نتائج سے لوگوں میں ان خدمات کی طرف میلان پیدا ہو اور جن خادموں کے ساتھ یہ رعایتیں کی گئی ہیں وہ حکومت کے احسان مند ہوں۔ یہ غرض بجائے خود ناجائز ہے، اس لیے اگر کوئی اس بندش میں رخنہ پیدا کرے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کا مجرم ہوگا تاہم زبردستی کا قانون الگ ایک چیز ہے جس کے لیے کسی اخلاقی بنیاد کی ضرورت نہیں۔

رہی یہ صورت کہ پرانی چیز دے کر کسی خفیہ طریقے سے نئی چیز اس کے بدلے حاصل کی جائے تو یہ یقیناً اخلاق کے خلاف ہے۔

سوال ۲:۔ آج کل کنٹرول کا زمانہ ہے مگر کوئی مال دکاندار کو کنٹرول نرخ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ وہ مجبوراً چور بازار (Black-Market) سے مال خرید کر گاہکوں کو سپلائی کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے مال کو کنٹرول ریٹ پر بیچنے میں اُسے خسارہ ہوتا ہے۔ لامحالہ وہ زیادہ نرخ لگاتا ہے۔ مگر بعض لوگ اس خرید و فروخت کو بے ایمانی اور فریب قرار دیتے ہیں اور پولیس بھی اس پر گرفت کرتی ہے۔ اس بات میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔ اخلاقی حیثیت سے حکومتوں کو تسعیر (Price control) کرنے کا اُس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ

وہ اپنی مقرر کردہ قیمتوں پر لوگوں کو مال دلوانے کا انتظام نہ کریں۔ اس چیز کا انتظام کیے بغیر محض اشیاء کے نرخ مقرر کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے پاس اشیاء کے ذخائر ہوں وہ ان کو چھپا دیں اور یا تو چیزیں بیچیں ہی نہیں یا قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے خفیہ طور پر زائد قیمتوں پر بیچیں۔ جو حکومت اس نتیجہ سے محض عقلاً ہی نہیں بلکہ از روئے تجربہ بھی واقف ہو اور پھر نرخ مقرر کرنے کی پالیسی اختیار کرے اس کو اخلاقاً یہ مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ لوگ اس کے مقرر کردہ نرخوں کی پابندی کریں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ عام خریدار، خوردہ فروش اور چھوٹے تاجر بڑے صاحب ذخیرہ لوگوں سے اگر حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر مال خریدنا چاہیں تو انہیں کچھ نہیں مل سکتا اور اگر چور بازار سے زائد قیمتوں پر مال خریدیں تو ان کے لیے یہ غیر ممکن ہے کہ اس مال کو حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر آگے بیچ سکیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی ضرورت پوری کرنے یا اپنی روزی کمانے کے لیے چور بازار سے مال خریدتا ہے اور زائد نرخوں پر اسے فروخت کرتا ہے تو وہ کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اگر اسے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے تو یہ حکومت کا مزید ایک ظلم ہوگا۔ ہمارے رفقا میں سے جو لوگ تاجر ہیں انہیں اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کو چاہیے کہ کچہری میں وکیل کے بغیر حاضر ہو کر اس پوزیشن کو صاف صاف مجسٹریٹ کے سامنے بیان کر دیں اور کہہ دیں کہ اگر ایسی صورت حال میں بھی آپ لوگوں کی حسِ انصاف ہمیں مجرم اور قابلِ سزا سمجھتی ہے تو آپ ضرور سزا دے دیں، ہم آپ کی ان عدالتوں سے بالاتر ایک عدالت سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا اور آپ کا انصاف ضرور کرے گی۔

"تسعیر" کے سلسلہ میں چونکہ ذکر آگیا ہے اس لیے میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں اسلام کی پالیسی کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ قیمتیں مقرر فرما دیجیے، لیکن آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں اپنے خدا سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ میرے اوپر تم میں سے کسی کے مال یا جان کا دعویٰ نہ ہو۔ پھر آپ نے مسلسل اپنے خطبوں میں اور اپنی گفتگوؤں میں یہ فرمانا شروع کیا کہ ضروریاتِ زندگی کو بازار میں لانے والا خدا سے رزق اور رحمت پاتا ہے اور ان کو روک رکھنے والا خدا کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے، اور یہ کہ جس نے چالیس روز تک غلہ روک کر رکھا تاکہ قیمتیں چڑھیں اور وہ ان حالات سے ناجائز فائدہ اٹھائے تو اللہ کا اس سے اور اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ کہ جس شخص نے چالیس دن غلہ روک رکھا، پھر اگر وہ سارا غلہ خیرات بھی کر دے تو یہ اس گناہ کی تلافی نہیں کرتا جو اس نے ۴۰ دن غلہ روک کر کیا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم احتکار کے خلاف مسلسل تبلیغ و تلقین فرماتے رہے، یہاں تک کہ تاجروں کے نفس کی اصلاح خود بخود ہو گئی اور جو ذخیرے روکے گئے تھے وہ سب بازار میں آگئے۔ یہ شان ہے اس حاکم کی جس کی حکومت اخلاقِ فاضلہ کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس کی اصل قوت پولیس اور عدالت اور آرڈیننس نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانوں کے قلب و روح کی تہوں میں برائی کی جڑوں کا استیصال کرتا ہے، نیتوں کی اصلاح کرتا ہے اور لوگوں سے رضاکارانہ اپنے ان احکام کی پابندی کراتا ہے جو صحیح اخلاقی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے یہ حکام جن کی اپنی نیتیں درست نہیں ہیں، جن کے اپنے اخلاق فاسد ہیں اور جن کی کرسی کے لیے جابرانہ تسلط کے سوا اور کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، اگر کبھی انہیں ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جیسے آج کل درپیش ہیں تو یہ سارا کام جبر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اخلاق کی اصلاح کرنے کے بجائے فسادِ اخلاق کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتے ہیں۔

اسلامی ریاست اور ذمی رعایا

سوال:۔ میں ہندو مہا سبھا کا ورکر ہوں۔ سال گذشتہ صوبہ ..... کی ہندو سبھا کا پروپیگنڈا سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی

میں جناب کے نام سے شناسا سا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں تنقیحات اور مرحوم سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم، اسلام کا نظریہ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، سلامتی کا راستہ وغیرہ دیکھی ہیں، جن کے مطالعہ سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطعاً بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہو گئی ہوتی تو ہندو مسلم مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومتِ الٰہیہ کی آپ دعوت دے رہے ہیں اس میں زندگی بسر کرنا قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ مگر چند امور دریافت طلب ہیں۔ خط و کتابت کے علاوہ ضرورت ہوگی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومتِ الٰہیہ کے اندر کس درجہ میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہلِ کتاب کے حقوق دیے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہلِ کتاب اور ذمی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر عربی حملہ کی تاریخ کا علم ہے، محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کے ہندوؤں کو اہلِ کتاب کے حقوق دیے تھے۔ امید ہے کہ آپ اس معاملہ میں تفصیلی طور پر اظہارِ خیال کریں گے۔

نیز یہ بھی فرمائیے کہ اہلِ کتاب اور ذمی کے حقوق میں کیا فرق ہے؟ کیا وہ ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں؟ کیا پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار ہوں گے جو کہ آپ حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ کیا قرآن کے فوجداری اور دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا ہندوؤں کا قومی قانون (Personal Law) ہندوؤں پر نافذ ہوگا یا نہیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ ہندو اپنے قانونِ وراثت، مشترکہ فیملی سسٹم اور متبنّٰی وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منوشاستر) کے مطابق زندگی بسر کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محض ایک متلاشیِ حق کی حیثیت سے پیش کیے جا رہے ہیں۔

جواب: میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ظاہر کیے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ کو پیچیدہ اور ناقابلِ حل حد تک پیچیدہ بنا دینے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اصولِ حق اور راستی کی بنیادوں پر مسائلِ زندگی کو حل کرنے کے بجائے شخصی، خاندانی، طبقاتی، نسلی اور قومی بنیادوں پر انھیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور اس بدقسمتی میں ہم آپ سب برابر کے شریک ہیں، کوئی بھی فائدے میں نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کے مختصر جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:۔

۱۔ اگر حکومتِ الٰہیہ قائم ہو تو اس کی حیثیت "ایک قوم کی حکومت دوسری قوم یا اقوام پر" کی نہ ہوگی، بلکہ دراصل وہ ایک اصول کی حکومت ہوگی اور اس کو چلانے کی ذمہ داری ظاہر بات ہے کہ وہی لوگ اٹھا سکیں گے جو اس اصول کو ماننے والے ہوں۔ دوسرے لوگ جو اس اصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں، ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر "اہلِ ذمہ" کی حیثیت حاصل ہوگی، یعنی جن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲- "اہل کتاب" اور عام "اہل ذمہ" کے درمیان اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳- ذمیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا، البتہ اصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذمی دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدہ کے ذمہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدہ میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذمی، تو ان کا ذمی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان اور مال اور آبرو کی کریں گے۔ ان کے شہری حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہو گی جو مسلمان کے خون کی ہے۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم بہ جبر ان پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔

ذمیوں کے متعلق قانون کی تفصیلات ان شاء اللہ ہم ایک کتاب کی شکل میں الگ شائع کریں گے۔

۴- جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لا کا تعلق ہے وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جزء ہے، اس لیے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح و طلاق اور قوانین وراثت و تبنیت کو اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے نہ ٹکراتے ہوں، ان پر جاری کرے گی، اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لا کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا برا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تب بھی ہم اس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے کیونکہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ یا مثلاً اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے، کیونکہ یہ اخلاق انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (Criminal Law) سے بھی ٹکراتی ہے، جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون (Law of the Land) بھی ہو گا۔ اسی پر آپ دوسرے امور کو قیاس کر سکتے ہیں۔

۵- آپ کا یہ سوال کہ آیا ذمی ملک کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں، مثلاً پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہو گا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومت الٰہیہ میں دیں گے؟ ـــــ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اصولی غیر قومی حکومت (Ideological- Non National state) کی صحیح حیثیت آپ نے اس میں ملحوظ نہیں رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ "پاکستان اور ہندوستان" کی ذہنیت اس میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اول میں تصریح کر چکا ہوں، اصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو اس اصول پر یقین رکھتے ہوں۔ وہی اس کی اسپرٹ سمجھ سکتے ہیں، انہی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین و ایمان سمجھتے ہوئے اس "ریاست" کے کام کو چلائیں گے اور انہی سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لیے اگر ضرورت پڑے تو میدان جنگ میں قربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اصول پر ایمان نہیں رکھتے، اگر حکومت میں شریک کیے بھی جائیں گے تو نہ وہ اس کی

اصولی اور اخلاقی روح کو سمجھ سکیں گے، نہ اس روح کے مطابق کام کر سکیں گے اور نہ اُن کے اندر ان اصولوں کے لیے اخلاص ہو گا جن پر اس اصولی حکومت کی عمارت قائم ہو گی۔ سول محکموں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر ملازمانہ ذہنیت کارفرما ہو گی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور اپنی قابلیتیں بیچیں گے۔ اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرائے کے سپاہیوں (Mercenaries) جیسی ہو گی اور وہ ان اخلاقی مطالبات کو پورا نہ کر سکیں گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے۔ اس لیے اصولاً اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملہ میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہلِ ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے برعکس فوجی حفاظت کا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہلِ ذمہ سے صرف جزیہ لینے پر اکتفا کرتی ہے (جزیہ اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہلِ ذمہ سے نہیں لیے جا سکتے)۔ رہے سول محکمے تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین و تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں، بہرحال اہلِ ذمہ کو نہیں دیے جا سکتے۔ البتہ محض کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو مجلسِ شوریٰ کے لیے منتخب کی جائے گی اس میں بھی اہلِ ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کونسلیں بنا دی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی دیکھ بھال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی نظم و نسق کے متعلق اپنی خواہشات، اپنی ضروریات اور شکایات کا اظہار بھی کر سکیں گی جن کا پورا پورا لحاظ اسلامی مجلسِ شوریٰ (assembly) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ جو بھی اس کے اصول کو تسلیم کرے وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہو سکتا ہے، خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ، لیکن جو اس کے اصول کو تسلیم نہ کرے وہ خواہ مسلم زادہ ہی کیوں نہ ہو، حکومت کی محافظت (Protection) سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہو سکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ "کیا تم ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرو گے جو حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو دو گے"؟ یہ دراصل پاکستانیوں سے کیا جانا چاہیے نہ کہ ہم سے۔ اگر آپ یہ سوال ہم سے کرتے ہیں تو ہم اس کا جواب اصولی حیثیت سے دیں گے اور وہ یہ ہے کہ جہاں حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اصولاً دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں: یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو، یا پھر ایسی حکومت جو ہندو قومیت کی بنیاد پر ہو۔ پہلی صورت میں آپ کے لیے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے حقوق حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو ملیں گے ویسے ہی حقوق ہم "رام راج" میں مسلمانوں کو دیں گے، بلکہ آپ کو اس معاملہ میں اگر کوئی رہنمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم و کاست اسی پر عمل کریں، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملے سے بہتر ہو گا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پا لیں گے، اور بعید نہیں کہ ایک روز ہماری حکومتِ الٰہیہ آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو ظاہر ہے کہ دیر یا سویر نتیجہ بھی برعکس نکل کر ہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت ہندو قومیت کی بنیاد پر قائم ہو تو اس صورت میں بھی آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جمہوری (Democratic) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں، یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (Subject Nation) کی حیثیت سے رہنا ہو گا۔ ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں، بہرحال آپ کے برتاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست اُن اصولوں میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمیوں سے معاملہ کرنے کے لیے "قرآن و حدیث" میں مقرر کر دیے گئے ہیں، حتیٰ کہ اگر آپ اپنی قومی ریاست میں مسلمانوں کا

قتل عام بھی کر دیں اور ایک مسلمان بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑیں تب بھی ان کے انتقام میں اسلامی ریاست کے کسی ذمی کا بال بیکا نہ کیا جائے گا۔ اور اس کے برعکس اگر آپ ہندو ریاست میں صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر ان چیف، غرض تمام کلیدی مناصب مسلمانوں کو دے دیں تب بھی اس کے جواب میں کوئی ایک ذمی بھی اسلامی حکومت کے کسی محکمہ کا نگراں (Director) نہ مقرر کیا جائے گا اور نہ کسی ذمی کو اسلامی فوج میں بھرتی کیا جائے گا۔

قرآن اور عربی زبان

سوال ۱:- وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ پڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ ہماری اور ہمارے آباؤ اجداد کی زبان عربی نہیں تھی۔ پھر قرآن کے عربی ہونے پر ہم کیوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے مکلف ہیں؟

جواب ۱:- جو نبی الگ الگ قوموں کے لیے آتے رہے ان کی دعوت تو اسی قوم کی زبان میں ہوتی تھی جس قوم میں وہ آئے تھے، لیکن جو نبی تمام قوموں کے لیے آئے اس کے لیے بھی بہرحال یہ ناگزیر ہے کہ وہ پہلے اس قوم میں دعوت و تبلیغ کا کام کرے جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور پھر اس قوم کو مسلمان بنانے کے بعد دنیا کی باقی دوسری قوموں میں تبلیغ کرنے کے لیے اسے ذریعہ بنائے۔ اس کے سوا ایک عالمگیر نبی کے لیے تبلیغ کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟

سوال ۲:- ایک سکھ دوست کو مطالعہ کے لیے کچھ لٹریچر دیا گیا ہے۔ مطالعہ کے دوران میں موصوف کی طرف سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ تم کہتے ہو کہ خدا بھیجتا ہے کلام کتاب ہے اور اسے پیغمبر خاص بندوں کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کے لیے ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی بھیجا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا اہم نظام ایک ایسی زبان میں کیوں پیش کیا گیا ہے جو ایک خاص خطۂ ارض میں بولی جاتی ہے؟ کیوں نہ اس خدا نے جو قادرِ مطلق کہلاتا ہے ایک عالمگیر زبان بنا دی، تاکہ ہر کوئی اس کے کلام سے یکساں مستفید ہوتا؟ عربی قرآن شریف تو صرف عربوں ہی کے لیے مفید ہے!۔

جواب ۲:- آپ کے جن سکھ دوست نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اگر اپنے تخیل کو تھوڑی حرکت اور دیتے تو اس سے بڑھ کر وہ یہ سوال بھی کر سکتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ براہِ راست ایک ایک انسان کے پاس خدا نے کیوں نہ بھیجا؟ کیونکہ جب وہ قادرِ مطلق ہے تو ویسا بھی کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں فرمایا ہے جس سے دنیا کے اُس انتظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئے جو اپنی فطری رفتار پر چل رہا ہے۔ انسانوں میں زبان کا اختلاف اور اس بنا پر نوعِ انسانی میں چھوٹے اور بڑے حلقے بن جانا ایک فطری چیز ہے جو خود اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اگر قادرِ مطلق ہے تو اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی سلطنت کا انتظام اٹل قوانین پر چل رہا ہے، انھیں قوانین کے ماتحت قوموں کی زبانوں اور ان کی روایات میں تنوع نمودار ہوتا ہے۔ اگر اسپرانٹو[1] کی قسم کی کوئی زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی جاتی تب بھی وہ نہ تو قوموں کی مادری زبان بن سکتی تھی نہ اس کے ادب سے قلوب متاثر ہو سکتے تھے اور نہ لوگ اس کی ادبی نزاکتوں کو محسوس (appreciate) کر سکتے تھے، الا یہ کہ قوموں کی مادری زبانوں کو اللہ تعالیٰ فوق الفطری طریقہ سے مٹا دیتا اور فوق الفطری طریقہ ہی سے اس اسپرانٹو کو زبردستی تمام قوموں کی زبان

---

[1] یہ اعتراض بالکل اسی نوعیت کا ہے جیسے عہدِ قدیم کے کفار و مشرکین کہتے تھے کہ نبی اگر سچا ہے تو اس کے ساتھ بڑے بڑے خزانے کیوں نہیں ہیں کہ آرام کی زندگی گزارے اور اپنی تحریک کو خوب پھیلا سکے۔ یا نبی انسان کیوں ہے اور انسانی ضروریات و کمزوریاں کیوں رکھتا ہے، اسے کوئی فرشتہ ہونا چاہیے اور فوق الفطری قوتوں سے اپنی تحریک کو پھیلانا چاہیے۔

بنا دیتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک کام اس کے دوسرے کام کو مٹانے کے لیے نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زبانوں کے سابق فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا کام انجام دیا ہے۔

یہ اعتراض کہ عربی میں قرآن شریف صرف عربوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے، اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا جبکہ اللہ نے صرف کتاب نازل کی ہوتی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب کے ساتھ رہنما بھی پیدا کیا۔ اس رہنما نے پہلے انسانوں کی ایک قوم کو جس کی زبان میں کتاب نازل ہوئی تھی، خطاب فرمایا اور اس قوم کو تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعہ سے اس نظام کے سانچے میں ڈھال دیا جو کتاب کے منشا کے مطابق تھا۔ پھر اس قوم کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو نبی کی قائم مقام بن کر اسی طرح خطاب کرے اور اسی طرح تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعہ سے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے جس میں پہلے وہ خود ڈھالی گئی تھی۔ پھر جو قومیں اس طریقہ سے اس نظام کو قبول کرتی جائیں وہ دوسری قوموں کے لیے یہی خدمت انجام دیں۔ یہ اس تعلیم کو عام کرنے کی فطری راہ تھی اور دنیا میں جس تحریک نے بھی عالمگیری کا کام انجام دیا ہے، خواہ وہ خدا پرستانہ ہو یا کسی دوسری نوعیت کی، بہر حال اس نے فطرتاً یہی راہ اختیار کی ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی کتاب صرف اسی قوم کے لیے مفید ہے جس کی زبان میں وہ لکھی گئی ہو تو پھر دنیا کی علمی تاریخ کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا۔ پھر تو انسانی تصنیفات کو بھی زبانوں کے لحاظ سے قوموں کے لیے مخصوص کر دینا ہو گا، ترجمہ اور بین الاقوامی تبلیغ کے تمام دوسرے ذرائع کے فائدہ سے انکار کر دینا ہو گا، حالانکہ یہی چیزیں ہیں جن کے بل پر بڑی بڑی تحریکوں کی دعوت اور بڑی بڑی انقلابی شخصیتوں کے پیغام دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتے رہتے ہیں۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ محض عربی زبان میں ہونے کی وجہ کر اسے عرب قوم کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا جائے۔

اگر کوئی شخص اس چیز سے مطمئن نہ ہو اور برابر اپنے اس اصرار پر قائم رہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، اسی طرح اللہ کو کام کرنا چاہیے تھا تو اسے اپنی رائے پر جمے رہنے کا اختیار حاصل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسے ویسے سوالات کو سد راہ بنا کر اگر ایک شخص ایک کتاب یا ایک پیغام سے استفادہ نہیں کرنا چاہتا تو نقصان کس کا ہے؟ یہ روش طالبان حق و صداقت کا نہیں ہوتا۔ وہ تو جگہ جگہ ٹوہ لگاتے پھرتے ہیں کہ سچائی کی روشنی کہاں ہے، اور کہاں سے وہ ملتی ہے۔ اگر آدمی دنیا کی ہر کتاب، ہر پیغام اور ہر تعلیم کے مقابلہ میں دل و دماغ پر کسی نہ کسی قسم کا قفل چڑھا لے تو پھر وہ ایک قدم بھی زندگی کی سیدھی راہ پر نہیں چل سکتا۔

رموز نبوت

سوال ۱: آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام کے رکوع ۹ سے تعلق رکھنے والے ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

"وہ (حضرت ابراہیمؑ) ھٰذَا رَبِّیْ کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے، کیونکہ ایک طالب حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھہرتا ہے، اصل اعتبار ان کا نہیں، بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔" (ترجمان جلد ۲۳، عدد ۵، ۶ صفحہ ۴)

سوال یہ ہے کہ اگر نبوت وہبی ہوتی تو حضرت ابراہیمؑ کو عام انسانوں کی طرح خدا کے الٰہ ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے میں تلاش و تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوت ایک

کسی معاملہ ہوا۔ اور ایک فلاسفر اور نبی کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔

جواب :۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا اور اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ نیز آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا اور فلسفیانہ استدلال سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا، ان دونوں میں بھی فرق نہیں کیا گیا۔

انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے مختلف نہیں تھی اور نہ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعہ حصولِ علم ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ وہ بھی انہی ذرائع سے، جو عام انسانوں کو حاصل ہیں، تحقیق و جستجو کی راہ طے کرتے تھے اور ایمان بالغیب کے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتے تھے جس کے بعد صرف ایمان بالشہادۃ کا مرتبہ باقی رہ جاتا تھا۔ پھر یہ آخری مرتبۂ ایمان نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد ان کو حاصل ہوتا تھا۔ اسی سے ان کی فضیلت عام انسانوں پر ثابت ہوتی ہے، ورنہ اگر ان کا ایمان بالغیب بھی اسی طرح وہبی قرار دیا جائے جس طرح کہ وحی ایک وہبی چیز ہے تو ان کے لیے کوئی فضل باقی نہیں رہتا۔

جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ واقعہ قرآن مجید میں آیا ہے، اگر اس کے ماقبل اور مابعد کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو وہاں مقصودِ بیان ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام انسانوں کو یہ بتایا جائے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق کس طرح حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

سوال ۱۳ :۔ یہ امر مسلّم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں، مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی، جیسے لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔

جواب :۔ نبی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی اول تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور پھر اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو غلطی ہوئی تھی وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبلِ نبوت نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بہت بڑا گناہ کیا تھا کہ ایک انسان کو قتل کر دیا، چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کو اس فعل پر ملامت کی تو انھوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ مجھ سے یہ فعل اس زمانہ میں سرزد ہوا تھا جبکہ مجھ پر راہِ ہدایت نہ کھلی تھی۔ مختصر یہ کہ نبی فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ انسان ہوتا ہے اور انسان کی معصومیت کا مفہوم فرشتوں کی معصومیت سے بالکل جداگانہ ہے۔

مستقبل کا خاکہ تعمیر

سوال ۱۴ :۔ مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے حسب ذیل سوال نامہ بھیجا گیا ہے:

کن اصول خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی اصلاح، اُن حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں، اسلامی اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہ کرم حسب ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے :۔

(۱) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی احیاء کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارس فکر کو متحد اور مربوط کیا جا سکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجیے جو اصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انھیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر وہ جیسے تیسے ایسی آزاد ریاستیں حاصل کرلیں جن میں ان کی اکثریت ہو، تو ایک ایسا نظام حکومت قائم کرسکیں جس میں مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خوش آیند ہم آہنگی پیدا ہوجائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(س) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔

جواب:- آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزا ہیں۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنھیں بنانا قرآن کا اصل منشا تھا۔ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہوجائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ انسان سے اس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انھوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کرلینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مدارات و مصالحت (Compromise) اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اصول پر جو پارٹی کام کرے گی اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آئے ہیں اول تو سرے سے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوئے بھی تو وہ اس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آئے ہیں۔ انھیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی، بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنی ہوگی جس سے بنی بنائی اسکیم کو نافذ کرسکیں۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پاسکیں اور وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے ننانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل، اور پچانوے فی صدی منحرف، اور نوے فی صدی انحراف پر مصر ہیں، یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اس منشا کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا

ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اس پورے مجموعہ کو جو اس وقت عملاً قائم ہے، تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں لیکن پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کچھ نہ پا سکیں گے۔

سوال ۲:۔ آپ کو علم ہوگا کہ مسلم لیگ نے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مجلس عمل کا تقرر کیا ہے۔ پھر اس مجلس عمل نے مختلف ذیلی مجالس مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ انہی میں سے ایک مذہبی و معاشرتی حالات کی اصلاح کے لیے ہے جس کے داعی کی طرف سے آپ کو ایک سوال نامہ غالباً موصول ہو چکا ہوگا[1]۔ اس سوال نامہ کو خاص توجہ کا مستحق سمجھیے اور ہر طرح کے اختلافات کو نظر انداز کر کے فکری تعاون فرمائیے۔ غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ابھی تک مسلمانوں نے اپنی تمدنی اہمیت کو مغربی سیلاب الحاد کے مقابلہ میں بچا رکھا ہے۔ اگر اس نازک لمحہ میں ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو ممکن ہے کہ نوجوان بلکہ بالعموم ترکی اور ایران کے نقش قدم پر چل نکلیں۔

جواب:۔ آپ کا عنایت نامہ آنے سے پہلے ہی میں لیگ کی مجلس عمل کو متذکرہ سوال نامہ کا جواب دے چکا ہوں۔ آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا بلکہ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حصہ لوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر (Half measures) میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں اور نہ داغ دوزی (Patch work) سے مجھ کو کبھی دلچسپی رہی ہے۔ مگر جو چیز مجلس عمل کے پیش نظر ہے وہ یہی کچھ ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیش نظر ہوتی تو میں بدل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا، لیکن یہاں کل کو بجنسہٖ برقرار رکھتے ہوئے اس کے بعض اجزا کو ہٹا کر ان کی جگہ بعض دوسرے اجزا لا رکھنا مطلوب ہے جس کے لیے کوئی قابل عمل اور نتیجہ خیز صورت سوچنے سے میرا ذہن عاجز ہے۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقہ سے کوئی بہتر نتیجہ نکال کر دکھا دیا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں مسلک کلی سے مسلک جزئی کی طرف منتقل (Convert) ہو جاؤں۔

پاکستان

سوال:۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافت ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ تمام عالم کو قانون الٰہیہ کے آگے مفتوح کرے۔

لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ! — تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابل اعتراض نہیں؟

یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے

---

[1] یہ وہی سوال نامہ ہے جو اوپر ہمارے جواب سمیت درج ہو چکا ہے۔

بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن ان کے قبضہ میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔

میرے خیال میں مسلمان —— یا بالفاظ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کر کھڑا نہ کر دے گی؟

جواب:۔ پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے، ان کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں، اسے اگر ان کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں، بلکہ ان کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لیا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بعینہ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انھیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کریں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ البتہ ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی اور علمبردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک قوم ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطہ میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظام اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

رُوداد مجلس تعلیمی

منعقدہ دارالاسلام

(از جناب طفیل محمد صاحب، قیم جماعت اسلامی)

اپنے نظریۂ تعلیمی کے مطابق ایک درسگاہ اور ایک تربیت گاہ کے قیام کی ضرورت تو ہماری جماعت کو ابتداء سے محسوس ہو رہی تھی اور موجودہ مرکز میں آنے کے بعد تو اس کے قائم کرنے کا ارادہ بھی کر لیا گیا تھا، لیکن مختلف اسباب سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی طرف جلدی اقدام نہ کیا جا سکا۔ حال میں جماعت کے جو مختلف اجتماعات بہار، پنجاب، دہلی اور دکن میں منعقد ہوئے، ان میں ارکان جماعت کی طرف سے بشدت اس بات کا مطالبہ ہوا کہ اب اس کام میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ مستقل مرکز کا فیصلہ جلدی سے جلدی کر لیا جائے تاکہ درسگاہ اور تربیت گاہ کے قیام میں مرکز کے عارضی ہونے کی وجہ سے جو رکاوٹ ہے وہ دور ہو جائے اور اطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر اس سلسلے کی تمام تعمیری تجاویز کو عمل میں لانا شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ دکن کے سفر سے واپس آنے کے بعد ہی ایک مختصر مجلس مشاورت کے لیے ۱۴، ۱۵، ۱۶ ر اگست کی تاریخیں تجویز کر لی گئیں اور اس مجلس کے انعقاد سے پہلے ایک طرف تو ایک مفصل تعلیمی سوال نامہ اخبار "کوثر" میں شائع کرایا گیا، تاکہ جو لوگ ہمارے اس کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور تعلیم کے مسائل پر بھی نظر رکھتے ہیں، وہ اپنی آراء سے ہمیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، اور دوسری طرف مرکز کی ضروریات کو واضح کرتے ہوئے جماعت کے ارکان اور ہمدردان سے درخواست کی گئی کہ مستقل مرکز کے لیے جگہ کے انتخاب کے متعلق جو جو تجاویز انھیں پیش کرنی ہیں وہ ضروری تفصیلات کے ساتھ انعقاد مجلس کی تاریخوں سے پہلے پہلے ہمارے پاس بھیج دیں، تاکہ ان سب کو پیش نظر رکھ کر مرکز کے بارے میں ایک آخری فیصلہ کر لیا جائے۔

ہمارے ان دونوں اعلانات پر تعلیمی اسکیم اور مرکز کی تجویز کے متعلق اچھی خاصی تعداد میں ارکان جماعت اور ہمدردوں کی جانب سے جوابات بروقت موصول ہو گئے جن میں سے اکثر کافی غور و خوض اور تحقیق سے مرتب کیے گئے تھے اور ہمارے کام میں مددگار ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر دے اور اقامت دین کی جد و جہد کے ہر مرحلے میں ہمارے ساتھ اسی طرح قلبی تعاون کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادہ فرمائے۔

حسب اعلان ۲۳ ر شعبان ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۴ ر اگست ۱۹۴۴ء کو دارالاسلام میں مجلس تعلیمی کا اجلاس سر دست ہوا۔ ہمارے ارکان اور ہمدردوں میں سے جو لوگ تعلیمی امور میں نظری اور عملی بصیرت رکھتے ہیں، ان سب کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور الحمد للہ کہ ان میں سے اکثر تشریف لے آئے تھے۔ مدعوین کے علاوہ اور بھی چند اصحاب جنھیں ان مسائل سے دلچسپی ہے، شریک جلسہ ہوئے۔ حاضرین کی تعداد بیالیس تھی۔

اجلاس اوّل

پہلا اجلاس نماز ظہر کے بعد دارالاسلام کی مسجد میں شروع ہوا۔ اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے امیر جماعت نے سب سے پہلے اپنا وہ مضمون پڑھ کر سنایا جو "نیا نظام تعلیم" کے عنوان سے ترجمان القرآن میں اور پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:۔

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر

"اگرچہ آپ سب حضرات اس مضمون کو جو ابھی میں نے آپ کو سنایا ہے، اس سے پہلے ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن میں نے یہاں اسے دوبارہ سنانا اس لیے ضروری سمجھا کہ یہی مضمون ہمارے اس تعلیمی نظریے اور اس تعلیمی پالیسی کا سنگ بنیاد ہے، جس پر ہمیں اب عملاً کام کرنا ہے، اور اس کام کو شروع کرتے وقت ہمارے ذہن میں ان بنیادی اصولوں کا مستحضر ہونا ضروری ہے جو اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ میں خود فن تعلیم کا ماہر نہیں ہوں اور اس کام کے لیے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے میں کوئی عملی اسکیم نہیں بنا سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اسلامی تحریک کو جس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے اور جن اوصاف اور جن قابلیتوں کے کارکن اُسے مطلوب ہیں ان کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ اور اس کے بعد ماہرین فن ہونے کی حیثیت سے یہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب عملی تدابیر تجویز کریں۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں، اس وقت ہمارے ملک میں جتنے نظام ہائے تعلیم رائج ہیں، ان میں سے کوئی بھی اُس مقصد کے لیے آدمی تیار نہیں کرتا جو ہمارے پیش نظر ہے، اور نہ اُس طرز کے آدمی تیار کرتا ہے جو ہمیں مطلوب ہیں۔ اسی لیے ہم کو اپنا نظام تعلیم الگ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ ہمیں صرف یہی نہیں کرنا ہے کہ نوخیز نسلوں کی علمی اور ذہنی تربیت کا انتظام اپنے نصب العین کے مطابق کریں بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی اور عملی تربیت کا بھی بندوبست کرنا ہے۔ اور یہ ضرورت خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے اور بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے کہ ہمارے ملک میں مدت ہائے دراز کے انحطاط کی وجہ سے اجتماعی تربیت کا نظام باقی ہی نہیں رہا ہے۔ پرانے زمانے میں اجتماعی تربیت کی جو صورت تھی وہ جدید زمانے کے سیاسی و تمدنی انقلاب کے مقابلے میں شکست کھا گئی۔ اور جدید سیاسی و تمدنی انقلاب نے اس کی جگہ اجتماعی تربیت کا کوئی دوسرا نظام مرتب نہیں کیا۔ بلکہ عامة الناس کو خودرو درختوں کی طرح اُگنے اور نشو ونما پانے کے لیے چھوڑ دیا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم یافتہ آدمیوں کی جتنی کمی ہے اُس سے بہت زیادہ کمی تربیت یافتہ آدمیوں کی ہے۔ مجھے اکثر یہ چیز بڑے رنج کے ساتھ محسوس ہوئی ہے کہ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی، خواہ وہ قدیم نظام تعلیم سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید نظام تعلیم سے، بالعموم اخلاق و شائستگی اور مہذب عادات اور ضبط و نظم کی بالکل ابتدائی اور بنیادی تربیت سے بھی عاری ہوتے ہیں، اور اس کی وجہ سے کوئی اعلیٰ درجہ کی جماعت جو کسی نصب العین کے لیے جدوجہد کر سکے اس ملک میں بنانی نہایت مشکل ہوتی ہے۔ جن قوموں میں اجتماعی تربیت کا نظام مکمل موجود ہے ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں بیشتر افراد مہذب اور منظم زندگی کی بنیادی تربیت حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں، اور جو شخص کوئی خاص تحریک ان کے اندر جاری کرنا چاہتا ہو اسے ان بنے اور سنورے ہوئے آدمیوں میں صرف اپنی تحریک کے لحاظ سے مناسب اوصاف پیدا کرنے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ بڑی دشواری ہے کہ انسانیت کی بنیادی تربیت ہی بڑی حد تک مفقود ہے، اور یہاں اگر کسی خاص نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی مقصود ہو تو آدمی کو بالکل ناتراشیدہ مواد خام

بلتا ہے جسے بالکل نئے سرے سے تراشنے اور سنوارنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے نظام تعلیم میں دماغی تربیت سے زیادہ اخلاقی تربیت کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیں اپنی اس دعوت کے لیے صحیح قسم کے کارکن میسر آسکیں جن کی نایابی کی وجہ سے ہمارا یہ کام ہماری انتہائی کوششوں کے باوجود آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ وجہ یہ کہ اس وقت ہم کسی ملک کے انتظام کا چارج نہیں لے رہے ہیں کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں ان تمام ضرورتوں کے لیے آدمی تیار کرنے ہوں جو ایک ملک کے تمدن کی پوری مشینری کو چلانے میں پیش آتی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف ایک کام ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اخلاقی، فکری اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں لیڈر اور کارکن تیار کریں۔ اس کام کے لیے ڈاکٹری یا انجینئرنگ یا سائنس وغیرہ کے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو دینِ اسلام اور علومِ اجتماعیہ (Social Sciences) میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھتے ہوں۔ آگے چل کر جیسا جیسا ہماری کارروائیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اور ہمارے اوپر ذمہ داریوں کا جتنا جتنا بار بڑھتا جائے گا اس کے لحاظ سے جن جن علمی شعبوں کے اضافے کی ضرورت ہوگی ان کا اضافہ ہم کرتے جائیں گے۔ فی الحال ہمیں اعلیٰ تعلیم کے صرف پانچ شعبے قائم کرنے ہیں جن کی تفصیل میں ابھی آپ سے بیان کروں گا۔ انہی شعبوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام کرنا ہے تاکہ ہم ان پانچوں شعبوں کے لیے طلبہ کو تیار کر سکیں۔

اب میں سب سے پہلے آپ کے سامنے اعلیٰ تعلیم کا معیارِ مطلوب پیش کرتا ہوں تاکہ وہ انتہا آپ کے پیشِ نظر ہو جائے جس تک پہنچنے کے لیے آپ کو اس وقت ابتدائی قدم اٹھانے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کا معیارِ مطلوب

۱۔ علمی | اعلیٰ تعلیم کے جن پانچ شعبوں (Faculties) کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) **فلسفہ**:۔ تاریخ فلسفہ، فلاسفۂ مسلمین کے مختلف سکول، فلاسفۂ غیر مسلمین کے مختلف سکول، علم کلام، فلسفۂ متصوفین، منطق، نفسیات، فلسفۂ اخلاق، نظری (Theoretical) سائنس، حکمتِ قرآن اور اس کی مدد کے لیے حدیث۔

(۲) **تاریخ**:۔ تاریخ اسلام، تاریخ مسلمین، تاریخ عالم (قدیم و جدید)، تاریخ انقلاب، فلسفۂ تاریخ، عمرانیات (Sociology)، مختلف عمرانی فلسفے، مدنیات (Civics)، سیاسیات، دساتیرِ عالم (Constitutions of The world)، اسلامی فلسفۂ تاریخ و فلسفۂ تمدن اور نظامِ اجتماعی و سیاسی کا مطالعہ قرآن و حدیث کی روشنی میں۔

(۳) **معاشیات**:۔ علم المعیشت، مختلف معاشی نظریے اور معاشی و تمدنی مسالک، دنیا کے مختلف معاشی نظام، مالیات (Finance)، بینکنگ (Banking) قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ معاشی نقطۂ نظر سے۔

(۴) **قانون**:۔ تاریخ قانون، اصولِ قانون، قوانینِ امم قدیمہ و جدیدہ، اصولِ قضا و نظامِ عدالت، قرآن و حدیث اور اسلامی مذاہبِ فقہیہ کا مطالعہ قانونی نقطۂ نظر سے۔

(۵) **علومِ اسلام**:۔ ادب و لغتِ عربی، تفسیر، حدیث، فقہ، علومِ اسلامی کی تاریخ، تاریخ افکارِ مسلمین، مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ، تاریخ ادیانِ عالم، فلسفۂ مذہب، دورِ جدید کی مذہبی و اخلاقی تحریکیں، مغربی الحاد کی تاریخ۔

۲- ذہنی و اخلاقی اس علمی معیار کے ساتھ ہم اُن لوگوں کو جو ان شعبوں میں تیار ہوں حسب ذیل اوصاف سے آراستہ پانا چاہتے ہیں:

(۱) فکر و نظر اور ذہنیت کے اعتبار سے پورے مسلمان ہوں اور اسلام کے لیے دنیا سے لڑنے کا گہرا جذبہ رکھتے ہوں۔

(۲) دین میں تفقہ اور مجتہدانہ بصیرت رکھتے ہوں اور وہ تمام استعدادیں ان کے اندر پوری طرح نشو و نما پا جائیں جو دنیا کے بگڑے ہوئے نظامِ تمدن و اخلاق کو توڑ پھوڑ کر ایک صالح نظامِ تمدن و اخلاق تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(۳) ان کی دماغی تربیت اتنی اعلیٰ درجہ کی ہو کہ اپنے زمانے کی علمی دنیا پر ان کی ریاست کا سکہ بیٹھ جائے۔

(۴) وہ ان اخلاقی اوصاف سے پاک ہوں جنھیں قرآن و حدیث میں کفار، فساق، اور منافقین کی صفات قرار دیا گیا ہے اور جنھیں ایمان کی ضد، اسلام کے منافی اور صالح سوسائٹی کے لیے غیر موزوں ٹھیرایا گیا ہے۔ اس کے برعکس ان میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر وہ اخلاقی اوصاف پرورش کیے جائیں، جو قرآن و حدیث میں عباداللہ، متقین، صادقین، صالحین، محسنین، فائزین اور مفلحین کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔

(۵) وہ دنیا میں اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو سکیں، ہر میدان کے مرد ہوں، کسی راہ میں عاجز و درماندہ نہ ہوں، صعوبتوں سے ٹکرا کر اپنا راستہ ہموار کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور زمین کو پیٹ کر ہر جگہ سے اپنا رزق حاصل کر لینے کی قابلیت ان میں موجود ہو۔

یہ ہے وہ سب سے اوپر کی منزل (Super structure) جو آخر کار ہمیں تعمیر کرنی ہے۔ اس بنارِ عالی کو سنبھالنے کے لیے آپ کو جس ثانوی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا اس میں لامحالہ حسبِ ذیل شعبوں کی علمی تیاری ناگزیر ہوگی۔

ثانوی تعلیم کا معیارِ مطلوب

عام۔ (۱) عربی زبان۔ انگریزی زبان یا کوئی اور یورپین زبان اس حد تک کہ تحقیقی مطالعہ کے لیے کافی ہو سکے۔

(۲) قرآن کے تحقیقی مطالعہ کی ابتدائی تیاری۔

(۳) اصولِ حدیث اور حدیث کی کسی مختصر کتاب کا تحقیقی مطالعہ جس سے طالب علم کے لیے آئندہ زیادہ گہرے تحقیقی مطالعے کی راہیں کھل جائیں۔

خصوصی شعبے۔ یہ اُن پانچ شعبوں (Faculties) کی مناسبت سے ہونے چاہییں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے تجویز کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک میں ان علوم کے مبادی اور مددگار علوم پڑھائے جائیں جن کا اعلیٰ تعلیم کے مرحلے میں طالب علم کو تحقیقی مطالعہ کرنا ہے۔ مثلاً:-

(۱) شعبۂ فلسفہ کے لیے مبادی منطق، فلسفۂ قدیم و جدید اور علمِ کلام پر ایک ایک کتاب جو ان علوم کی اصطلاحات، طرزِ بیان اور بنیادی مسائل سے واقفیت کے لیے کافی ہو۔ نیز نفسیات، طبیعیات اور علمِ کیمیا پر بھی ایک ایک ابتدائی کتاب۔

(۲) شعبۂ تاریخ کے لیے تاریخ، عمرانیات اور سیاسیات کا ایسا کورس جس سے طلبا کو تاریخی تحقیق اور تمدن و متعلقاتِ تمدن کی گہرائیوں میں اترنے کا طریقہ معلوم ہو اور وہ ان علوم سے فی الجملہ روشناس ہو جائیں۔

(۳) شعبۂ معاشیات کے لیے ایسا کورس جس سے طالب علم انسانی سوسائٹی کی ترکیب (Structure) اور اس کے بنیادی

مسائل کو بحیثیت مجموعی سمجھ لے اور پھر معاشیات، مالیات، بینکنگ اور کاروبار معیشت کے اصول سے واقف ہونے کے علاوہ موجودہ زمانہ کے معاشی نظاموں اور مسلکوں سے بھی فی الجملہ روشناس ہو جائے۔

(۴) شعبۂ قانون کے لیے اصولِ قانون، اصول فقہ، تاریخ قانون اور تاریخ فقہ اسلامی پر ایک ایک ابتدائی کتاب اور فقہ مذاہب اربعہ کے مسائل کا ایک مختصر مجموعہ۔

(۵) شعبۂ علوم اسلامی کے لیے زبان عربی کا ایک مزید کورس اُس عام کورس کے علاوہ جو متوسط تعلیم کے لیے تجویز کیا جائے۔ نیز فقہ اور تاریخ فقہ پر ایک ایک کتاب اور تقابل ادیان پر ایک کتاب جس میں تاریخ ادیان بھی شامل ہو۔

ان دونوں بالائی منزلوں کو سنبھالنے کے لیے آپ کو اپنی تعمیر کی ابتدا جس نچلی منزل سے کرنی ہے اُس کی تفصیلات آپ حضرات کو خوب غور و خوض کے ساتھ تجویز کرنی چاہییں تاکہ بنیاد نہایت مضبوط ہو اور طلبا میں علمی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے وہ ضروری قابلیتیں اور صفات پیدا ہو جائیں جو مہذب انسانوں اور ہماری اس تحریک کے کارکنوں میں بہرحال ناگزیر ہیں۔ اس مرحلہ میں آپ کو اس امر کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا کہ جو طلبہ آپ کی ابتدائی منزل سے آگے بڑھنے والے نہیں ہیں انھیں بنیادی تعلیم و تربیت سے اس حد تک آراستہ ہو جانا چاہیے کہ جوہر انسانیت اور جوہر اسلامیت کے اعتبار سے وہ ناقص نہ رہ جائیں اور متمدن و مہذب زندگی کے فعال عنصر ہونے کے لیے جو قابلیتیں ضروری ہیں وہ ان میں پیدا ہو جائیں۔ اس کام کے لیے جتنی مدت آپ چاہیں تجویز کریں اور اس مدت کو جتنے مراحل پر چاہیں تقسیم کریں، یہ ماہرین فن ہونے کی حیثیت سے آپ کا اپنا کام ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ابتدائی تعلیم کی تکمیل پر ہم اپنے طلبہ میں کیا قابلیتیں اور کیا اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ اس معیار مطلوب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں کہ اس معیار کے طلبا تیار کرنے کے لیے آپ کو کتنی مدت اور کیا سرو سامان درکار ہے۔

ابتدائی تعلیم کا معیار مطلوب

اخلاقی:۔ (۱) شائستگی، پاکیزگی، صفائی، تمیز حسن و قبح اور ذوق سلیم۔

(۲) اخلاق حسنہ: انفرادی، عائلی اور اجتماعی۔

(۳) انضباط (Discipline) باقاعدہ اور مہذب طریقہ سے سوسائٹی میں رہنے اور کام کرنے کے ڈھنگ، محاسبۂ نفس کی عادت، احساس فرض، احساس ذمہ داری۔

(۴) وسعت قلب، وسعت نظر، وسعت تصور، بلند حوصلگی، خودداری۔

(۵) عزم و ارادے کی پختگی، متانت و سنجیدگی (Seriousness)، خلوص نیت، اور یہ ضروری صفت کہ جس معاملہ سے بھی دلچسپی لیں اس میں ان کی دلچسپی منافقانہ طرز کی نہ ہو۔

(۶) جرأت و دلیری، جفاکشی، چستی، ہر طرح کا کام کر لینے کی صلاحیت، زندگی کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ واقفیت (نہ صرف معلومات کی حد تک بلکہ عملاً بھی)۔

(۷) اسلامی نصب العین کا عشق اور گہرا اسلامی جذبہ جو روح اور قلب میں اُترا ہوا ہو اور جس کا اظہار بچوں کی تمام حرکات و سکنات سے ہو۔

(۸) اسلامی اوزان اور پیمانوں (Islamic standard of Values) سے ہر چیز کو ناپنے اور تولنے کی عادت۔

(۹) جماعتی زندگی کے لیے وہ مناسب اوصاف جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۰) ضروری انتظامی صلاحیت۔

(۱۱) تحقیق تجسس اور تفکر و مشاہدہ کی عادت، کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دنیا میں رہنا، باقاعدگی کے ساتھ سوچنا، استدلال کرنا اور پرکھنا۔

عملی۔ (۱) کشتی، تیراکی، بنوٹ، تلوار کا استعمال، گھوڑے کی سواری، سائیکل سواری، بندوق کا استعمال۔

(۲) پھاوڑے، کدال، ہتھوڑے، بیلچے، آری، بسولے اور برمے سے کام لینے پر قادر ہونا۔ ابتدائی طبی امداد سے عملاً واقف ہونا۔

(۳) منڈی سے مال خریدنے اور اپنا مال بیچ لانے پر بے جھجک قادر ہونا۔

(۴) دارالاقامہ کے انتظام، کسی بڑے اجتماع کے اہتمام اور کسی بڑی پارٹی کے لیے سفر کے انتظام پر قادر ہونا۔

(۵) دفتری کاموں سے واقفیت، تجارتی مراسلت کی مشق۔

(۶) تقریر، تحریر، تبلیغ، گفتگو اور ترغیبی مذاکرہ (Convassing) پر قادر ہونا۔

(۷) کسی حد تک کھانا پکانے، کپڑا کترنے اور سی لینے پر قادر ہونا۔

علمی:۔ (۱) اردو نوشت و خواند اس پیمانے پر کہ طالب علم صحیح اردو لکھ سکے، ہر طرح کا اردو لٹریچر پڑھ اور سمجھ سکے اور اپنے خیالات تحریر اور تقریر میں ادا کر سکے۔

(۲) ابتدائی عربی قرآن کو فی الجملہ سمجھ لینے کی حد تک۔

(۳) فارسی، گلستان و بوستاں پڑھ سکنے کی قابلیت تک۔

(۴) ابتدائی انگریزی اُن علوم کی ابتدائی کتابیں انگریزی میں سمجھ لینے اور ان کا ترجمہ کر لینے کے قابل جنھیں معلوماتِ عامہ کے سلسلے میں طالب علم اردو میں پڑھے گا۔

(۵) ضروری ریاضی جو ذہنی تربیت اور ہماری متوسط اور اعلیٰ تعلیم کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔

(۶) جغرافیہ، طبعی، عالمی، قرآنی اور ہندی۔

(۷) تاریخ اسلام و مسلمین، سیر انبیاء و صحابہ و صلحاء امت، اور تاریخ ہند کی ضروری معلومات۔

(۸) اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق واضح تصورات۔ نیز فقہ کی وہ ضروری تفصیلات جو ایک مسلمان کو اپنی مذہبی زندگی کے لیے لازماً معلوم ہونی چاہییں۔

(۹) صحتِ عامہ، وظائفِ اعضاء (Physiology) طبعیات، علم الکیمیا، فلکیات، ارضیات، بغرض اپنے جسم، اپنی سوسائٹی اور اپنے ماحول کے متعلق ضروری معلومات۔

(۱۰) ڈرائنگ، سکیل ڈرائنگ، ماڈل ڈرائنگ اور فری ہینڈ پینٹنگ میں صفائی اور ستھرائی اور صحت اور حسنِ ذوق۔ نیز نقشہ بنانے اور نقشہ سمجھنے (Map Reading) کی قابلیت۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا عارضی انتظام

یہ تو وہ امور تھے جو مجھے اصل نظام تعلیم کے متعلق عرض کرنے تھے۔ اب میں ایک اور ضروری چیز کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہماری تحریک کی حقیقی ضرورتیں محض ابتدائی یا ثانوی تعلیم سے پوری نہیں ہو سکتیں بلکہ وہ صرف اس انتہائی تعلیم ہی سے پوری ہو سکتی ہیں جس کے پانچ شعبوں کی طرف میں ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس انتہائی مرحلے پر پہنچنے میں ہمیں ابھی بہت دیر لگے گی۔ لیکن ہماری تحریک کی موجودہ ضروریات کا تقاضا اتنا شدید ہے کہ ہم اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے اس وقت تک زیادہ انتظار نہیں کر سکتے جب تک ہمارے طلبہ ابتدائی تعلیم سے بتدریج ترقی کرتے ہوئے انتہائی منزل پر پہنچیں گے۔ اس لیے اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کا ایک عارضی انتظام بہرحال ہمیں جلدی سے جلدی کرنا چاہیے تاکہ وہ لوگ جو کالجوں اور عربی مدرسوں میں تعلیم پا چکے ہیں، انھیں ہم اسلامی نقطۂ نظر سے علمی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے تیار کر سکیں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہمیں اس وقت جن اعلیٰ درجے کے کارکنوں اور رہنماؤں کی ضرورت ہے وہ تیار ہو سکیں گے۔ دوسرے یہ کہ اس عارضی انتظام سے جن لوگوں کو ہم تیار کریں گے وہی ہمارے نظامِ تعلیم کے ثانوی اور اعلیٰ شعبوں میں درس و تدریس اور کتبِ نصاب کی تیاری کا کام کر سکیں گے۔ آگے چل کر ہم اس عارضی انتظام کو تھوڑے رد و بدل کے ساتھ اپنی اعلیٰ تعلیم کے ایک مستقل شعبے میں تبدیل کر دیں گے تاکہ ان لوگوں کو جو ہماری ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مرحلوں سے نہ گذرے ہوں بلکہ یہ مراحل دوسری درسگاہوں سے طے کر کے آئیں، ہم اپنی اعلیٰ تعلیم کی کلاسوں میں داخل ہونے کے لیے تیار کر سکیں۔

اس عارضی تعلیم کے لیے نصاب اور مدتِ تعلیم اور مراحل تعلیمی تجویز کرنا آپ حضرات کا کام ہے، میں صرف وہ معیار پیش کیے دیتا ہوں جو اس تعلیم کی تکمیل کے وقت طلبا کی قابلیت کا ہونا چاہیے۔

معیار مطلوب

(۱) قرآن اور حدیث میں اتنی محققانہ نظر کہ طالبِ علم زندگی کے مختلف مسائل میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے رہنمائی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۲) فقہ اسلامی سے اتنی واقفیت کہ طالبِ علم مختلف مذاہبِ فقہیہ کے اصولِ استنباط اور ان کے دلائل اور حجتوں سے واقف ہو جائے۔

(۳) معقولاتِ قدیمہ سے اتنی واقفیت کہ طالبِ علم قدما کی کتابوں سے استفادہ کر سکے، اور معقولاتِ جدیدہ سے اتنی واقفیت کہ موجودہ دور کے علمی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

(۴) علومِ اجتماع سے اتنی واقفیت کہ طالبِ علم موجودہ دور کے تمدنی مسائل اور تمدنی تحریکوں کو ناقدانہ حیثیت سے اچھی طرح سمجھ سکے۔

(۵) تاریخِ عالم پر اجمالی نظر، عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ہندوستان اور یورپ کی جدید تاریخ سے خصوصی واقفیت۔

اب میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ اپنا کام شروع کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے اس کام میں برکت عطا فرمائے اور آپ کی رہنمائی فرمائے"۔

اس تقریر کے بعد سوالنامے کے جوابات ارسال کرنے والوں میں سے جو جو اصحاب موجود تھے ان کو ان کے جواب نامے دے دیے گئے تاکہ امیرِ جماعت کی افتتاحی تقریر کی روشنی میں اگر وہ اپنے جوابات میں کوئی اضافہ، ترمیم یا اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں۔

اور اگلے روز کے اجلاس کے لیے تقریر مذکور کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کریں۔ اب نمازِ عصر کا وقت ہو چکا تھا، اس لیے بعد نمازِ عصر اجلاس ختم ہوا اور سب حضرات علیحدہ علیحدہ یا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اجلاس دوم

دوسرے روز نو بجے (قدیم) کانفرنس کا دوسرا اجلاس پھر مسجد دار الاسلام میں شروع ہوا اور دوپہر کا تھوڑا سا وقفہ چھوڑ کر عصر تک جاری رہا۔ سب جوابات جو سوالنامہ کے جواب میں موصول ہوئے تھے، حاضرین میں تقسیم کر دیے گئے تاکہ ہر سوال کے متعلق جوابات کو بسہولت یک وقت پیش کیا جا سکے۔ سوالنامے کے ایک ایک سوال پر بہ ترتیب بحث شروع ہوئی۔ امیر جماعت سوال نامے سے ایک سوال کو پڑھتے تھے پھر اس کے مختلف جوابات جو لوگوں کی جانب سے وصول ہوئے تھے پڑھے جاتے تھے۔ پھر ان پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر اور بحث و تمحیص ہوتی اور آخری فیصلے کو تحریر کر لیا جاتا۔ جو امور طے ہوئے وہ درج ذیل ہیں:۔

مجلس تعلیمی کی قراردادیں

کل مدتِ تعلیم:۔ (۱) کل مدتِ تعلیم چودہ سال ہونی چاہیے جسے حسبِ ذیل مرحلوں میں تقسیم کیا جائے:۔

(ا) ابتدائی مرحلہ۔ ۸ سال۔ (ب) ثانوی مرحلہ۔ ۲ سال۔ (ج) اعلیٰ مرحلہ۔ ۴ سال۔

مرحلۂ ابتدائی (۲) سرِدست صرف ابتدائی مرحلے کے لیے ایک درسگاہ قائم کی جائے جس کے انچارج غازی عبد الجبار صاحب ایم اے۔ بی ٹی ہوں۔

(۳) اس درسگاہ کی ابتدائی جماعت میں ۶ سال سے لے کر ۸ سال کی عمر تک کے طلبا داخل کیے جائیں۔

نوٹ:۔ درمیانی جماعتوں میں داخل ہونے والے طلباء کو امتحاناً ایک مقرر عرصہ تک (جو زیادہ سے زیادہ تین ماہ ہو) درجۂ خاص (Special class) میں رکھا جائے، ایک ہم عمر طالب علم کو اس کا رفیق مقرر کیا جائے جو اسے مرکز کی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعارف کرائے، اس رفیق کے نگراں اس نووارد کے نگراں بھی ہوں گے اور وہ کوشش کریں گے کہ نووارد جلدی سے جلدی کسی ایک درجے کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے اور مرکز کی پوری زندگی میں شامل ہونے کے قابل ہو جائے۔

(۴) یہ درسگاہ لازماً اقامتی (Residential) ہوگی۔

(۵) طلباء کی تعلیم اور پرورش کے مصارف ان کے سرپرستوں کو برداشت کرنے ہوں گے۔

(۶) اس درسگاہ میں صرف ان لوگوں کے بچوں کو داخل کیا جائے گا جو نہ صرف جماعت کے نصب العین سے متفق ہوں بلکہ درسگاہ میں بچوں کو داخل کرتے وقت اس بات کا تحریری اقرار نامہ داخل کریں کہ وہ اپنے بچوں کو کسی نوعیت سے غیر اسلامی نظام کے کارکن بنانے کے لیے تیار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنے بچوں کو اس نصب العین کی خدمت کے لیے دیدیا ہے۔

(۷) ابتدائی منزل میں طلبہ کو کسی خاص پیشہ کے لیے تیار کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ ہم یہ کوشش کریں گے کہ اپنی عملی اور اخلاقی تربیت سے بچوں کی تمام پیدائشی قابلیتوں اور استعدادوں کو اس حد تک نشو و نما دیدیں اور انھیں عملاً اس حد

تک مشاہدہ اور تجربہ کرا دیں کہ وہ آٹھ سال کی تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اندر یہ طاقت محسوس کرنے لگیں کہ خدا کی زمین میں ہر طرف ان کے لیے کام کرنے اور اپنی ضروریات حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں اور وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اپنی درسگاہ کے فارغ شدہ طلباء کے معاشی مسئلہ کا یہی ایک حل ہے۔

(۸) نصاب اور درسیات کی ترتیب کا کام حسب ذیل پانچ حضرات کی مجلس کے سپرد کیا گیا اور اس مجلس کو اختیار دیا گیا کہ اس کام میں جن جن اصحاب سے چاہے مدد لے اور چار مہینے میں اپنی تجاویز کا خاکہ مرتب کرے:

(۱) غازی عبدالجبار صاحب (۲) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔ (۳) قاضی حمید اللہ صاحب (سیالکوٹ)

(۴) نعیم صدیقی صاحب۔ (۵) خواجہ محمد صدیق صاحب (دہلی)

غازی عبدالجبار صاحب اس مجلس کے داعی ہوں گے۔

نوٹ:۔ جو جوابات ہمارے سوالنامے کے جواب میں موصول ہوئے ہیں، نیز جو مواد درسیات کے سلسلے میں آیا ہے وہ سب اس مجلس کے حوالے کر دیا گیا۔

(۹) درسگاہ کے انتظامی امور، اساتذہ کے انتخاب، اساتذہ کی تیاری، دار الاقامہ اور درسگاہ کے نظم و نسق، تعمیرات اور دیگر انتظامی کاموں کا نقشہ مرتب کرنے کے لیے حسب ذیل حضرات کی مجلس مقرر کی گئی:۔

(۱) سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ (۲) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔ (۳) غازی عبدالجبار صاحب۔ (۴) چودھری محمد اکبر صاحب (سیالکوٹ)

غازی عبدالجبار صاحب اس مجلس کے بھی داعی ہوں گے۔

ثانوی و اعلیٰ تعلیم کا عارضی انتظام (۱۰) اس تعلیم کے لیے ایک الگ درسگاہ قائم کی جائے جس کے انچارج مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ہوں گے۔

(۱۱) اس کی مدت تعلیم چھ سال رکھی جائے۔ دو سال مرحلۂ ثانوی کے لیے اور چار سال مرحلۂ تکمیل کے لیے۔

نوٹ:۔ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کے لیے ایسی آسانیاں فراہم کر دی جائیں کہ وہ اس سے کم مدت میں مرحلۂ تکمیل طے کر سکیں۔

(۱۲) مرحلۂ ثانوی کی ابتدائی منزل میں داخل ہونے کے لیے ایسے لوگ امیدوار ہو سکتے ہیں جو کم از کم میٹریکولیٹ ہوں یا کسی عربی مدرسہ کے متوسط درجہ کے معیار تک تعلیم پا چکے ہوں۔

(۱۳) درسگاہ میں امیدواروں کا داخلہ ملاقات (Intirview) کے بعد ہوگا۔

(۱۴) صرف ایسے امیدواروں کو درسگاہ میں داخل کیا جائے گا جو جماعت اسلامی کے نصب العین سے متفق ہوں۔

(۱۵) طلبہ کو اپنے مصارف کا خود کفیل ہونا ہوگا۔

(۱۶) اس درسگاہ کے نصاب و درسیات اور جملہ انتظامی امور کی تفصیلات مرتب کرنے کے لیے حسب ذیل اصحاب کی ایک مجلس مقرر کی گئی:۔

(۱) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔ (۲) مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی۔ (۳) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی۔ (۴) مولانا ابواللیث شیر محمد صاحب اصلاحی۔

نوٹ :- مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اس مجلس کے داعی ہوں گے اور چار ماہ کے اندر اپنی تجاویز پیش کریں گے۔

اجلاس ختم ہونے سے پہلے اعظم ہاشمی صاحب مہاجر ترکستانی نے درخواست پیش کی کہ ہندوستان میں روسی ترکستان سے نکلے ہوئے جو مہاجرین آباد ہیں اُن کے بچوں کے لیے کسی مخصوص انتظام کی گنجائش رکھی جائے تاکہ وہ ایک طرف اردو زبان سیکھ کر ہمارا نصابِ تعلیم پڑھنے کے قابل ہو جائیں اور دوسری طرف انھیں ترکی زبان پڑھنے کا بھی موقع ملے۔ اس پر امیر جماعت نے فیصلہ کیا کہ اگر کم از کم بیس طلبہ مہاجرین میں سے آئیں تو ان کے لیے اردو اور ترکی تعلیم کا علیحدہ انتظام کیا جا سکتا ہے۔

اجلاس سوم

تیسرے روز دارالاسلام کی مسجد میں پھر اجتماع ہوا جس میں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ مستقل مرکز کہاں بنایا جائے۔ اس سلسلے میں ہم سے آئی ہوئی حسب ذیل تجویزوں اور پیش کشوں پر غور کیا گیا :-

(۱) جماعت بریلی کی تجویز کہ بریلی شہر سے ۵ میل کے فاصلے پر توسیع شہر کے لیے جو اراضی قابلِ فروخت ہیں انھیں خرید لیا جائے اور وہاں جماعت اپنے صَرف سے عمارات تعمیر کرے۔ اس صورت میں صرف زمین خریدنے کے لیے تقریباً اسی ہزار روپے درکار ہوں گے۔

(۲) جماعتِ کپورتھلہ کی تجویز کہ شہر جالندھر کے باہر جالندھر۔کپورتھلہ سڑک پر ایک زمین خریدی جائے جس کی قیمت اٹھائیس ہزار روپیہ ہے۔ اس رقم میں سے ایک چوتھائی حصہ جماعتِ کپورتھلہ اپنے ذمہ لیتی ہے، لیکن یہ رقم (تقریباً سات ہزار) وہ صرف اس صورت میں پیش کر سکتی ہے جبکہ مرکز اس کی تجویز کردہ جگہ پر تعمیر کیا جائے۔

(۳) چودھری عبدالرحمان خاں صاحب ایم، ایل، اے۔ رئیس راہوں کی پیش کش جس میں انھوں نے راہوں اسٹیشن کے قریب اپنی دس ایکڑ زمین بلا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا اور مرکز کی تعمیر کے لیے چار ہزار روپیہ نقد دینے کا بھی وعدہ کیا، بشرطیکہ مرکز وہاں تعمیر کیا جائے۔

(۴) منظور احسن صاحب کمرڈبی (مانبھوم) کی پیش کش جس میں انھوں نے تعمیر کرنے کے لیے کمرڈبی سے متصل اپنی پندرہ بیس بیگھے زمین بلا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ مقام بہار اور بنگال کی سرحد پر کلکتہ، گیا، اور جمشید پور کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔

(۵) مولوی عبدالستار صاحب (حیدرآباد دکن) کی پیش کش کہ مانک گڑھ ریلوے اسٹیشن سے سات میل کے فاصلے پر ریاست حیدرآباد میں وقفِ مدینہ نگر کی چار سو بیگھے زمین (جس میں کوئی عمارت نہیں ہے) سے وہ بحیثیت متولی ہماری جماعت کو بلا معاوضہ فائدہ اٹھانے کا موقع دے سکتے ہیں، بشرطیکہ مرکز وہاں تعمیر کیا جائے۔

(۶) صاحب موصوف کی دوسری تجویز کہ حیدرآباد شہر کے نواح میں سید علی گوڑہ کے متصل ایک زمین خریدی جا سکتی ہے جس کا نرخ ۶ر سے ۸ر گز تک ہوگا۔ نیز ایک بڑی مسجد اور ایک خانقاہ کی عمارت پہلے سے وہاں موجود ہے جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

(۷) ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز مدیر "کوثر" لاہور کی تجویز کہ ننڈی پور کے مقام پر گوجرانوالہ سے سات میل دور نہر چناب کے کنارے گوجرانوالہ۔سیالکوٹ سڑک پر ایک وقف کی ساڑھے پندرہ ایکڑ زمین سے بلا معاوضہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکتا ہے۔

نیز اس کے قریب مزید اراضی اگر ضرورت پڑے تو خریدی جا سکتی ہے۔

(۸) دارالاسلام ٹرسٹ کی پیش کش، کہ اگر جماعت اسلامی اپنا مستقل مرکز اسی جگہ رکھے تو حسب ذیل شرائط پر وہ یہ زمین معہ عمارات (جن میں مسجد، لائبریری، فیملی کوارٹرس، بارہ کمرے، ایک بڑا ہال، اور تقریباً ساٹھ ایکڑ زمین شامل ہیں) اس کے حوالے کر سکتے ہیں:۔

ا۔ اراضی وقف کی آمدنی مطابق شرائط وقف نامہ تعلیم قرآن پر صرف کی جائے۔ اس کے علاوہ جو آمدنی دیگر ذرائع سے دارالاسلام ٹرسٹ کو وصول ہو وہ مطابق صوابدید ٹرسٹیان صرف کی جائے۔

ب۔ کل سامان ملکیت ٹرسٹ، مثلاً فرنیچر، برتن، کتب خانہ وغیرہ جماعت اسلامی کے سپرد کیا جائے گا اور وہ اسے حدود دارالاسلام کے اندر جس طرح چاہے استعمال کرنے کی مجاز ہوگی۔

ج۔ موجودہ عمارات اور مزید عمارات جو دارالاسلام ٹرسٹ یا جماعت اسلامی کے صرف سے اراضی وقف پر تعمیر ہوں، اُن پر جماعت اسلامی بطور مالک کے قابض ہوگی۔ عمارات کی مرمت کا صرف جماعت اسلامی کے ذمے ہوگا۔ فرنیچر، کتب خانہ، اور دیگر سامان اسی ذیل میں سمجھا جائیگا۔

د۔ یہ انتظام دائمی جماعت اسلامی کے ساتھ اس وقت تک طے شدہ رہے گا جب تک وہ اپنے موجودہ مقاصد پر قائم رہے گی۔

ھ۔ اگر خدانخواستہ جماعت اسلامی منتشر ہو جائے تو وہ سب کچھ جو دارالاسلام ٹرسٹ جماعت اسلامی کے حوالے کر رہا ہے، وقف اسلام سمجھا جائے گا اور دارالاسلام ٹرسٹ کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اگر کسی وقت جماعت اسلامی بنامر کر تبدیل کرے تو اس صورت میں بھی یہ شرط نافذ ہوگی۔

ان شرائط کے علاوہ چودھری نیاز علی خاں صاحب نے ذاتی طور پر یہ وعدہ بھی فرمایا کہ جو حقوق بطور واقف انھیں اس وقف پر حاصل ہیں، وہ ان سے سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے۔

نوٹ:۔ واضح رہے کہ دارالاسلام ٹرسٹ کے صدر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں، اور اس کے چھ ٹرسٹیوں میں سے دو ٹرسٹی مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور غازی محمد عبدالجبار صاحب ہیں۔

ان تمام تجاویز اور پیش کشوں کے اچھے اور برے پہلوؤں پر آزادانہ بحث ہوئی۔ آخر کار امیر جماعت کی اس رائے کو تمام حاضرین نے بالاتفاق تسلیم کر لیا کہ دارالاسلام ٹرسٹ کی پیش کش کو قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی دارالاسلام ٹرسٹ کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اور جماعت اسلامی کے ارکان اور ٹرسٹ کے ارکان کی موجودگی میں مذکورہ بالا شرائط پر ٹرسٹ اور جماعت کے درمیان معاہدہ قرار پا گیا۔ نیز چودھری نیاز علی خاں صاحب نے حسب وعدہ سب صاحبان کے سامنے اعلان فرما دیا کہ

"جو حقوق بطور واقف مجھے اس وقف پر حاصل ہیں، میں ان سے سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی کے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔"

اس کے بعد سب حاضرین نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس مرکز کی تاسیس میں برکت عطا فرمائے اور اپنی تائید و نصرت سے ہماری مدد کرے اور یہاں ہم کو وہ کام کرنے کی توفیق بخشے جس میں اس کی رضا ہو۔

مطبوعات

مولانا عبید اللہ سندھی :- تالیف پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مجلد۔ ضخامت ۳۸۴ صفحات۔ قیمت للعہ۔ سندھ ساگر اکیڈمی، شپل روڈ، لاہور۔

مولانا سندھی مرحوم، جن کی وفات زمانۂ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد و تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش و ولولہ رکھتے تھے، انھیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ ان کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات کو سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی ہے۔ خود مولانا سندھی مرحوم بھی اپنی زندگی میں اس کی توثیق فرما چکے ہیں کہ یہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی ہے، لہٰذا یہ کتاب اس لحاظ سے، اور صرف اسی لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے کہ یہ قریبی عہد کے ایک ایسے صاحبِ فکر کی واضح ترجمانی کرتی ہے جو خود اپنے آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکا تھا۔

لائق مولف نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر مرحوم کے خیالات ہی کی طرف منعطف رہی ہے اور اس سلسلہ میں ان کا دائرۂ بیان بہت وسعت اختیار کر گیا ہے، حتیٰ کہ فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف، تاریخ، اور سیاسیات کے بکثرت مسائل اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ایسی ایک وسیع المبحث کتاب، خصوصاً جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں کافی غرابت بھی رکھتی ہو، ایک مختصر تبصرے میں تنقید کا حق پوری طرح نہیں پا سکتی۔ مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورۂ بالا مسائل کے بارے میں جو طرزِ فکر اس کے اندر پایا جاتا ہے وہ ہندوستان میں کوئی نیا طرزِ فکر نہیں ہے بلکہ نانک، کبیر، اکبر، دارا شکوہ اور رام موہن رائے وغیرہم کے ذریعہ سے پہلے بھی ہندوستان اس سے آشنا ہوتا رہا ہے۔ فرق اگر ہے تو روح میں نہیں بلکہ مواد بحث، طریق استدلال اور تفصیلات میں ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں ہے کہ اس طرزِ فکر کو اسلام اور اصلی اسلام کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کی اتنی بے باکانہ کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی

ہمارا کام بھی نسبتاً بہت ہلکا اور کم ناخوشگوار ہو جاتا اگر ان خیالات کو محض ایک فکر آزاد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہوتا۔ لیکن چونکہ انھیں فکر اسلامی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور بتکرار ان دعووں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اصل دین یہ ہے نہ کہ وہ جو مولانا سندھی سے اختلاف رکھنے والے سمجھے ہیں، اس لیے ہم اس دلی تکلیف کے ساتھ جو مولانا مرحوم کے ہر مخلص نیازمند کو ان کی وفات کے اس قدر قریب زمانہ میں ان کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے محسوس ہونی چاہیے، بعض ایسے بنیادی امور کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو اس مجموعۂ افکار میں اسلامی طرزِ فکر سے صریحاً متصادم نظر آتے ہیں۔

"تمام مذاہب کی تعلیمات کو الگ رکھ کر تاریخ انسانیت کا مطالعہ کرو تو اصول ارتقا اور اصول زوال مل جائیں گے۔"

اگر یہ سچ ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر سلسلۂ نبوت و وحی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تاریخ انسانیت کے مطالعہ سے خود اپنے لیے حسبِ ضرورت قانونِ ارتقا مستنبط کر سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر نظام پچھلے تجربات سے استفادہ کر کے ہی بنتا ہے۔ پھر آخر پیغمبر کس لیے آتے رہے؟ مفکرین ہی اس کام کے لیے کافی تھے۔ دراصل اس نظریہ میں ایک غلط فہمی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانیت کے تجربات ہماری رہنمائی کرتے ہیں مگر ان سے ترقی و تنزل کے قوانین اخذ کرنے اور واقعات کے اسباب و علل تلاش کرنے کے لیے جس بے لاگ نظر اور جس بے لاگ تفکر کی ضرورت ہے وہ کسے حاصل ہے؟ کون ایسا انسان ہے جو تمدن کی مشینری کے پیچیدہ اجزا کے عمل و تعامل کو بہمہ وجوہ سمجھتا بھی ہو اور پھر ان سے نوامیس عاملہ کو تلاش کرتے وقت خواہشات، جذبات اور تعصبات سے اپنے ذہن کو یکسر خالی بھی کر سکے۔ انسان کی یہی کمزوری نبوت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اگرچہ نبی جو قانونِ اخلاق اور نوامیس حیاتِ اجتماعیہ پیش کرتا ہے ان کے لیے وہ بھی استشہاد تاریخ انسانیت ہی سے کرتا ہے، مگر اس کی آنکھ جہالت اور خواہش اور تعصب کے شیشوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی۔

"مولانا کا یہ عقیدہ ہے کہ زمانہ کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور زندگی کے اسباب و حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اسی نظام کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔"

یہاں قضائے الٰہی اور رضائے الٰہی کے فرق کو نظر انداز کر کے ایک ایسی عظیم الشان بنیادی غلطی کی گئی ہے جسے اگر اس کے منطقی نتائج تک پہنچا دیا جائے تو ضلالت اور ہدایت، فسق اور طاعت، صلاح اور فساد سب یکساں حق ٹھہرتے ہیں، بلکہ حق اور باطل کا امتیاز ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اقتضائے زمانہ سے جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ مشیت یا قضائے الٰہی کے تحت ہی رونما ہوتا ہے، مگر حق پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ جو کچھ زمانے کے تقاضے سے رونما ہو اسے حق کہہ دیا جائے۔ "زمانہ کا تقاضا" ہی اگر تعمیرِ مستقبل کے لیے محرک اور اساس ہو تو پھر اُفق کے اُس طرف سے کسی جداگانہ فوق الفطری تحریکِ اصلاح و انقلاب اور تعلیمِ حق کے آنے کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ زمانہ کا تقاضا تو قوموں کو ہر راہ پر چلاتا ہے چاہے وہ راہ عیاشی کی ہو، سرمایہ پرستی کی ہو، الحاد کی ہو، یا ظلم کی، اور پھر قومیں جس راہ پر بھی جانا چاہتی ہیں قضائے الٰہی ان کے حق میں ہی کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی کہ اس قضا کو حجت قرار دے کر ایسی سب راہوں کو صراطِ مستقیم سمجھ لیا جائے۔

"تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے...... اس وجود سے ہونا مراد نہیں، بلکہ وہ حقیقت مراد ہے جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بلا کسی موجود کرنے والے کے موجود ہے... اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں، وہ اعتباری ہیں، اس لیے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے۔" (بحوالہ شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی)

یہاں اس عقیدہ کی عقلی اور نقلی غلطیوں پر بحث کرنے کا موقع نہیں، مختصر یہ ہے کہ یہ ایک شدید ترین گمراہی کا فلسفہ ہے جسے صوفیوں کے ایک گروہ سے سندِ حقانیت مل جانے کے باعث تقدس کا مقام حاصل ہو گیا۔ اس کی جو تقریر مصنف نے شاہ محمد حسین صاحب کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے اس کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ نکلیں گے کہ تمام موجودات کے اندر خدا خود کام کر رہا ہے، اور جب یہ بات ہے تو پھر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہو رہا ہے، غلطی کا اس میں کچھ کام نہیں۔ یہی عقیدہ اقتضائے زمانہ (تاریخ) کو "ارادۂ ربانی" بنا دیتا ہے اور پھر انسان کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ رفتارِ زمانہ پر یہ سمجھتے ہوئے بہتا چلا جائے کہ یہ سب کچھ منشائے الٰہی ہے۔ اسی عقیدے سے ہیگل کا تصورِ تاریخ پیدا ہوا ہے جس کا

مدعا یہ ہے کہ اعتباری تشخصات و تعینات کے اندر جو جوہر اصلی کام کر رہا ہے وہ ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ دو متضاد طاقتوں کا روپ دھار کر کے تصادم در تصادم کا معرکہ چھیڑے ہوئے ہے تاکہ اپنی تکمیلی منزل کو پہنچ سکے۔ تاریخ کا یہ باطل تصور منجملہ اور بہت سے غلط نتائج کے، ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ نوع انسانی اضطراراً سیدھی ارتقاء کی راہ پر بڑھی چلی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان جب انبیاء کی ہدایت کو مان لیتا ہے تو تاریخ ارتقاء کرتی ہے اور جب وہ اس ہدایت سے روگردانی کر لیتا ہے تو تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

"تمام انسانوں میں ایک وحدتِ فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطۂ اشتراک ہے اور اسی سے ادیان اجتماع
اور اقوام کے اختلافات کم ہو جاتے ہیں۔ نیز قرآن اور دوسری الٰہی کتابیں اسی وحدتِ فکری کی ترجمانی ہیں"

یہ وحدتِ ادیان کے اس تصور کی ایک ذرا سی جھلک ہے جسے مصنف نے مولانا مرحوم کی ترجمانی کرتے ہوئے کافی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اول تو یہ تصور وحدۃ الوجود کے اس فلسفے کا قدرتی اقتضاء ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، مزید برآں مولانا مرحوم نے جس طرز پر نیشنلزم اور بین الاقوامیت کو یکجا جمع کیا تھا اس کا بھی یہ لازمی تقاضا تھا کہ ایک طرف تو وہ بین الاقوامیت کی خاطر (اور ہندوستانی نیشنلزم کی خاطر بھی) وحدتِ ادیان کا ایک فلسفہ وضع کرتے اور دوسری طرف مخصوص مذہبی شرائع اور قوانین اور تہذیبی صورتوں کو قومی خصوصیات قرار دے کر ان کے ترک و اختیار کی آزادی تمام قوموں کے لیے ثابت کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا ہے۔ وہ چند مطلق (بے صورت) صداقتوں کو اصل دین قرار دے کر کہتے ہیں کہ وہ تمام ادیان اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور قرآن در اصل انھیں کی طرف دعوت دینے آیا ہے، پھر ان شرائع اور سنن کو جو قرآن اور اسوۂ محمدی میں مقرر کی گئی ہیں اور جن پر عہد نبوت و خلافت راشدہ میں مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کی تشکیل کی گئی تھی محض قومی رسوم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان رسوم کو عالمگیر قانونِ زندگی بنانا مقصود نہ تھا بلکہ دینِ مطلق کے اندر ان رسوم کو قومی حالات و ضروریات کے مطابق ڈھالنے اور بدل لینے کی گنجائش ہے۔ مصنف کے الفاظ میں اس کی تقریر ملاحظہ ہو:

ا۔ "جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دور میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی ہی حکومت نہیں بن سکتی"۔

ب۔ "قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہ اسی صورت میں ظاہر ہو"۔

ج۔ "اگر صرف پہلے کے بنے ہوئے شرائع و آئین پر ہی سارا انحصار ہے تو پھر قرآن کی اثر آفرینی کا انجام ظاہر ہے"۔

د۔ "اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانونِ اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت انہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں"۔

س۔ مولانا کے نزدیک بھی کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ در اصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں"۔

ایک مختصر تبصرے میں زیادہ اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی تاہم ان چند اقتباسات سے مولانا کے خیالات کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہر سوچنے والے کو ہر بات سوچنے کا اختیار حاصل ہے، مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآنی تعلیمات اور سنت محمدی کے ایک حصے کو دائمی اور عالمگیر اور دوسرے حصے کو قومی اور وقتی قرار دینے اور پھر بلا دلیل و سند یہ کہنے کا کسی کو کیا حق ہے کہ دراصل یہی قرآن اور پیغمبر صلعم کا مدعا تھا اس کے بعد مولانا کے تخیل کی آخری منزل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ شرائع اور سنن کو وقتی اور قومی قرار دینے کے بعد مولانا یہ چاہتے تھے کہ اس دین مطلق کو جس کا تصور اوپر بیان ہوا ہے، لے لیا جائے اور اس کے ساتھ قرآنی و محمدی شرائع و سنن کے بجائے ان شرائع و سنن کا جوڑ لگا دیا جائے جو ہم کو یورپ اور اشتراکی روس وغیرہ سے ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک یورپ اور اشتراکی روس کے طریقوں میں اگر کوئی قصور ہے تو صرف یہ کہ ان کے ساتھ دین مطلق کا جوڑ لگا ہوا نہیں ہے۔ اس مضمون کو بھی مصنف نے کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم اساس کی حیثیت دیں۔"

"میں مادیین کے تصور کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے۔"

"اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت مادی زندگی کی تنظیم کا منتہائے کمال ہے۔"

"نیا روس بالکل لادینی تھا اور مولانا کے دینداری لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح جذبہ کو سرگرم عمل پایا......... آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے۔"

صاف اور سیدھی زبان میں اگر اسے بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ صرف چند مطلق مذہبی تصورات قرآن سے لے لیے جائیں ۔۔ اور قرآن ہی سے کیوں؟ وہ تو تمام مذاہب و ادیان میں ہیں ہی مشترک! ۔۔۔ رہی شریعت اور تہذیب و تمدن و معاشرت کی مخصوص شکل، تو اس معاملہ میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ صرف عرب کی قوم کے لیے تھا، لہٰذا ہمیں آزادی ہے کہ اسے کلاً یا جزءً اپنے لیے منسوخ ٹھیرا کر شریعت فرنگ اور سنن روسیہ کو اختیار کر لیں۔

تخیل کی ان بے پایاں وسعتوں کو لیے ہوئے مولانا جب تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس، اکبر اور اورنگ زیب سب ہی یکساں قابل قدر اور قابل تعریف نظر آتے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا نظریات کو ایک نظام فکر کی شکل میں مرتب کر کے جو شخص بھی دنیا پر نگاہ ڈالے گا اسے باطل تو کہیں نظر آہی نہیں سکتا، تمام مختلف چیزیں خواہ وہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہی کیوں نہ ہوں، اس کے تخیل کی فضائے مطلق میں حق کی حیثیت سے جگہ پا سکتی ہیں۔

اگر ہم حسن ظن سے کام لیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے نظام فکر کے بیشتر اجزاء ایسے تھے جو ان کا اصل عقیدہ و مسلک نہ تھے بلکہ انھوں نے یہ ایک جدید علم کلام محض اس لیے مرتب کیا تھا کہ ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں دین کی دعوت انہی اصولوں پر پھیلائی جا سکتی تھی، لیکن اس حسن ظن کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ فلسفہ و کلام قطعی غلط اور سراسر ضلالت ہے اور اگر دین کی دعوت پھیلنے کی بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے تو اس طرح اس کے پھیلنے سے نہ پھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقے سے تھا جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حد کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے اور

پھر بھی تنقید کی رہ میں بندا ور تعریف کی زبانیں تر رہیں، ورنہ اگر کہیں انھوں نے اس طبقہ خاص کی بلہر جگہ پائی ہوتی تو ان کا استقبال سر سید اور علامہ مشرقی کے کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ :۔ از مولانا عبید اللہ سندھی، مرحوم۔ مجلد ضخامت ۲۴۰ صفحات قیمت ۸ر۔ سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔

یہ مولانا مرحوم کے اس مقالہ کی جدید ترتیب و تسہیل ہے جو مولانا نے جریدۂ الفرقان، بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھا تھا۔ پروفیسر محمد سرور صاحب نے اس کی زبان کو سہل اور اس کے مطالب کو عام ناظرین کے فہم سے قریب تر کرنے کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس مقالہ میں مولانا مرحوم نے اپنے مخصوص فلسفہ اور نظریات کو بھی شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم کی تشریح میں داخل کر دیا ہے، مگر اس کے باوجود یہ مقالہ اس امر کی ایک زندہ شہادت ہے کہ مولانا مرحوم کی نظر حضرت شاہ صاحب کے لٹریچر میں نہایت عمیق تھی۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو اس کا مطالعہ کرے، یہ اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا فی الحقیقت ایک بڑے دقیقہ رس اور وسیع النظر عالم تھے۔

ضروری اعلان

...ن ...ذیل کتب ...جود ہیں

خطبات۔	۸ر	اسلام اور جاہلیت۔	
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول	۱۲ر	سلامتی کا راستہ۔	
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم	۱۲ر	نیا نظام تعلیم	عہ/
روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔	۱۳ر	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔	۶ر
رسالہ دینیات	۸ر	ایک اہم استفتاء	۲ر
مسئلہ قومیت	۸ر	اسلامی حکومت ۔۔۔۔ کا انگریزی ترجمہ۔	۹ر
تنقیحات	۸ر	نیشنلزم اینڈ انڈیا۔	۹ر
ہیگل، مارکس اور نظام اسلام۔	۸ر	راہ عمل (سیاسی کشمکش سوم کے دو مضمون)	۶ر
حقوق الزوجین	۸ر	دین حق	۶ر
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	۲ر	ایمان کی کسوٹی۔	۲ر
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶ر	لا الٰہ الا اللہ کے معنی۔	۲ر

دیگر مکتبوں کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی موجود ہیں۔

(۱) الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر۔ قیمت ۳ ر (۲) حقیقت شرک۔ قیمت ۸ر۔ (۳) اسلام کا استغاثہ قیمت ۸ر۔ (۴) ذہنی زلزلے۔ قیمت ۸ر۔ (۵) تماشا۔ قیمت ۸ر۔ (۶) مذہب کا انقلابی تصور۔ قیمت ۶ر۔ حقیقت نفاق قیمت ۸ر۔

مکتبۂ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)